شذرات

اخلاقی جارحیت	منظور الحسن	۲
مذہب، اخلاقیات اور تعلیم	خورشید ندیم	۴

قرآنیات

النساء ــــ المائدہ (۴-۵)	جاوید احمد غامدی	۷
النساء (۴:۱)	جاوید احمد غامدی	۸

معارف نبوی

حیا اور ایمان	طالب محسن	۱۱
قریش کے بارے میں ایک روایت	معز امجد	۱۵

دین و دانش

ایمانیات (۷)	جاوید احمد غامدی	۱۷

نقد و نظر

انجیل کی زبان؛ ایک ناقدانہ جائزہ	محمد اسلم صدیق	۲۳
انجیل کی زبان؛ یونانی یا سریانی	عبد الستار غوری	۳۱

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اخلاقی جارحیت

حقوق کے تحفظ کے لیے ہم مسلمانوں کا لائحۂ عمل مسلح جارحیت ہے۔ گزشتہ تین صدیوں سے ہم اسی پر کاربند ہیں۔ قوم کے مذہبی اور سیاسی پیشواؤں نے اسی کو اختیار کرنے کی تلقین کی ہے اور عوام الناس پوری دل جمعی سے اس پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی روح یہ ہے کہ اگر ہم منتشر ہوں تو تشدد آمیز کارروائیوں کے ذریعے سے دنیا کو اپنے مسائل کی طرف متوجہ کریں اور اگر کچھ مجتمع ہوں تو جنگ وجدل سے اپنا حق حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ یہ لائحۂ عمل اختیار کر کے ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا ہے، اس کی تفصیل کشمیر، فلسطین، افغانستان اور عراق کے موجودہ حالات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ تین صدیوں کے حوالے سے ہماری یافت ونایافت کی فہرست بندی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، وہ شکست وتنزل اور غربت وجہالت ہے اور جس سے محروم ہوئے ہیں، وہ عظمت ورفعت اور علم و اخلاق ہے۔ مسلح جارحیت کے اس لائحۂ عمل کو ہم نے ہمیشہ جہاد سے تعبیر کیا ہے اور اس طرح اپنے اقدامات کو یہ شرعی عنوان دے کر دنیا کو پیغام دیا ہے کہ اسلامی شریعت جنگ وجدل کی علم بردار ہے۔

شریعت کی اصطلاح میں جہاد اقوام کے ظلم وجبر کے خلاف اسلامی ریاست کا مسلح اقدام ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اس اقدام کے لیے قوت ایمانی کے ساتھ ساتھ مادی قوت کا حصول ناگزیر ہے۔ مگر ہمارا طرز عمل ہمیشہ یہ رہا ہے کہ نہایت کمزور ایمان اور اسلحے کی قوت سے بالکل محروم ہونے کے باوجود نصرت الٰہی کے دعوے کے ساتھ میدان جنگ میں اترتے رہے ہیں۔ یہ سفاہت ہے یا دین سے ناآشنائی، بہرحال اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ہم اپنے لاکھوں رجال کار کو جنگ کی بھینٹ چڑھا کر فارغ ہو چکے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہم نے علم ودانش، اصلاح و دعوت اور قومی تعمیر وترقی کے دروازے بھی بند کر رکھے ہیں۔

چنانچہ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ علم، اخلاق اور رزق کے معاملے میں ہم پر نہایت کس مپرسی کی حالت طاری ہے۔ہم غربت کے اس مقام پر ہیں کہ ہماری اکثریت بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے۔ جہالت کی یہ سطح ہے کہ ان علوم سے بھی غافل ہو چکے ہیں جنھیں خود ہم نے وجود بخشا تھا۔اخلاقیات کا یہ عالم ہے کہ بددیانتی، دھوکا دہی، ملاوٹ اور قانون شکنی دنیا میں ہماری علامت بن گئی ہے۔ بے وقاری کی یہ حالت ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں ہم پر کوئی اعتماد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔اور مظلومیت کا یہ معاملہ ہے کہ صحیح ہوں یا غلط، ہر حال میں مجرم قرار پاتے ہیں اور سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہماری اس حالت زار کی سب سے بڑی وجہ لائحۂ عمل کی غلطی ہے۔افغانستان اور عراق کے پے در پے سانحوں کے بعد ممکن ہے کہ ہم اس غلطی کا ادراک کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔اگر ایسا ہو جاتا ہے تو پھر ہمیں مسلح جارحیت کا لائحۂ عمل ترک کر کے اخلاقی جارحیت کے نئے لائحۂ عمل کو اختیار کرنا چاہیے ۔یہی وہ واحد راستہ ہے جسے اپنا کر کوئی کمزور اور مظلوم قوم اپنے لیے تعمیر وترقی کے بند دروازے کھول سکتی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ ہم اگرچہ اپنی تعداد کے لحاظ سے دنیا کی چند بڑی اقوام میں شمار ہوتے ہیں، مگر قوت واستعداد کے لحاظ سے اقوام عالم میں ہمارا کوئی مقام نہیں ہے۔ دنیا کے سیاسی، اقتصادی اور سائنسی وتکنیکی منظر پر ہماری کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ اس بات کا امکان ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی جگہ پیدا ہو جائے۔اس اعتراف حقیقت کے بعد ہمیں مسلح جدوجہد کے بجائے غیر مسلح طور پر اخلاقی جدوجہد کا آغاز کرنا چاہیے۔ہم انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے اعلیٰ اخلاقی معیار پر کھڑے ہو جائیں۔قومی اور بین الاقوامی، دونوں معاملات میں اخلاقی موقف اپنائیں اور اس کے لیے اگر مفادات بھی قربان کرنے پڑیں تو اس سے دریغ نہ کریں۔اگر تشدد کا سامنا کرنا پڑے تو صبر واستقامت کے ساتھ اس کا سامنا کریں۔اپنے حقوق کی جدوجہد کو سرتاسر مظلومانہ بنائیں اور ظالم کو یہ موقع نہ دیں کہ وہ کسی بہانے ہم پر حملہ آور ہو سکے۔اس مقصد کے لیے اگر تنازعات کو یک طرفہ طور پر بھی ختم کرنا پڑے تو اس سے بھی گریز نہ کریں۔ دنیا کے ایوانوں میں ہر حال میں مظلوم کا ساتھ دیں۔ عدل وانصاف کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑیں خواہ اس کی زد اپنے قومی وجود ہی پر کیوں نہ پڑے۔ ہر طرح کے تعصب کو بالاے طاق رکھتے ہوئے آزادی، جمہوریت، مساوات اور انسانی ہمدردی جیسی اقدار کا بول بالا کریں۔ ہر حال میں جنگ کی مذمت کریں اور امن وسلامتی کی تلقین کریں۔ مذہبی اور سیاسی اختلافات کو برداشت کریں اور دوسروں کو بھی یہی طرز عمل اپنانے کی نصیحت کریں۔ان مقاصد کے حصول کے لیے موجودہ زمانے کی اخلاقی بیداری

سے بھر پور فائدہ اٹھائیں، ان اداروں کی تعمیر و ترقی میں کردار ادا کریں جو دنیا میں انسانی حقوق کی آواز بلند کر رہے ہیں اور میڈیا کے تمام ذرائع کو پوری طرح بروے کار لائیں۔

اخلاقی جارحیت، درحقیقت صبر و برداشت اور حکمت و دانش سے عبارت ہے۔ جب کوئی قوم کسی ظالم قوم کے مقابلے میں مجبور و بے بس ہو، جب اس کے پاس دفاع کی معمولی طاقت بھی موجود نہ ہو، جب اقوام عالم میں سے کوئی اس کی مدد کی ہمت نہ کر سکے اور جب دنیا میں کوئی ایسی عدالت بھی قائم نہ ہو جو اس پر ہونے والے ظلم کو قانون کی قوت سے روک سکے تو اس موقع پر واحد لائحۂ عمل اخلاقی جارحیت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جور و ستم کا مقابلہ اخلاق و کردار کی قوت سے کیا جائے۔ قومی وجود میں امن، آزادی، استدلال، عدل، صلہ رحمی اور حق پرستی جیسی انسانیت کی مشترک اقدار کو مستحکم کیا جائے اور ان کی بنا پر انسان کے اجتماعی ضمیر کو آواز دی جائے۔ کوئی قوم اگر صبر و استقامت سے یہ آواز بلند کرتی رہے تو انسانیت کا اجتماعی ضمیر لازماً اس پر لبیک کہہ اٹھتا ہے۔ بصورت دیگر عالم کا پروردگار اپنی آواز اس آواز میں شامل کر دیتا ہے۔ مظلوم کی دادرسی آسمان سے ہوتی ہے اور ظلم و جبر کی بساط بالآخر لپیٹ دی جاتی ہے۔

ـــــ منظور الحسن

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

مذہب، اخلاقیات اور تعلیم

مذہب اور اخلاقیات کا باہمی تعلق کیا ہے؟

انسان کی معلوم علمی تاریخ میں اخلاقیات کا بنیادی ماخذ ہمیشہ مذہب ہی رہا ہے۔ یہ مقدمہ کہ انسان اصلاً ایک اخلاقی وجود ہے، سب سے پہلے مذہب ہی نے پیش کیا۔ اس لیے بیسویں صدی میں جب اس خیال کو قبولیت عام ملی کہ انسان کے جملہ معاملات کی اصلاح کے لیے تنہا عقل کی رہنمائی کفایت کرتی ہے تو اس کے نتیجے میں لبرل اخلاقیات (Liberal Ethics) کے تصور نے جنم لیا۔ اس طرح انسان اپنی دانست میں وحی سے بے نیاز ہو گیا۔ اسی خیال کے زیر اثر آج ہمارے ہاں بھی بعض لوگ مذہب اور اخلاقیات کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک تعلیمی کانفرنس میں جب مذہبی تعلیم کے مسئلے پر جاوید احمد صاحب غامدی اور وزیر اعظم شوکت عزیز صاحب نے اظہار خیال کیا تو بعض لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ وزیر اعظم مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی یک جائی کے علم بردار ہیں اور محترم

جاوید صاحب اس کے برخلاف دونوں کو الگ رکھتے ہیں۔ جہاں تک جاوید صاحب کا معاملہ ہے تو میں یہ بات بالاطمینان عرض کرتا ہوں کہ ان کی طرف اس بات کا انتساب درست نہیں۔ انھوں نے اس موضوع پر کئی بار قلم اٹھایا اور متعدد بار کلام کیا۔ مذہبی تعلیم اور اخلاقیات کے باب میں ان کے افکار کا حاصل اگر میں نکات کی صورت میں بیان کروں تو میرے فہم کی حد تک اس کی نوعیت کچھ اس طرح ہے۔

۱۔ مذہب کا بنیادی مقصد انسان کا تزکیہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ انبیا مبعوث فرماتے ہیں اور اسی مقصد کے لیے آسمان سے کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں انسان کے اخلاقی وجود کی تعمیر مذہب کا مطمح نظر ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو اس طرح پاک کرے کہ وہ دوسری دنیا میں اللہ کی بادشاہی اور اس رضا کا مستحق قرار پائے جسے جنت کہتے ہیں۔

۲۔ مذہب کی تعلیمات ہمہ جہتی ہیں۔ ان تعلیمات کا ایک دائرہ تو وہ ہے جن کا تعلق ایمانیات اور عبادات سے ہے۔ ایک دائرہ وہ ہے جو اخلاقیات سے متعلق ہے اور ایک دائرہ معاملات سے بحث کرتا ہے۔

۳۔ مسلمان معاشرے میں ایک بچہ تین ذرائع سے تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اپنے گھر سے، ماحول سے اور درس گاہ سے۔ ایمانیات اور عبادات کی تعلیم وہ بالعموم گھر سے حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا سماجی ماحول بھی اس میں اپنا کردار ادا کرتا ہے جس میں مسجد، محلّہ، بزرگ اور امام وخطیب سب شامل ہیں۔ اس ضمن میں ایک کردار تعلیمی ادارے یا درس گاہ کا بھی ہے۔

۴۔ ایک بچہ جب اسکول میں داخل ہوتا ہے تو بالعموم اس کی عمر پانچ ساڑھے پانچ برس ہوتی ہے۔ یہ بچہ جب اسکول جانا شروع کرتا ہے تو یوں نہیں ہوتا کہ گھر اور ماحول جیسے فطری تعلیمی اداروں سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ سیکھنے کا یہ عمل حسب روایت جاری رہتا ہے، جہاں سے وہ ایمانیات اور عبادات وغیرہ کی تعلیم لے رہا ہوتا ہے۔ جہاں تک اسکول کی سطح پر مذہبی تعلیم کا تعلق ہے تو اس کا آغاز اخلاقیات سے ہونا چاہیے۔ یعنی پانچویں جماعت تک اسکول میں اسے مذہب کا وہ حصہ پڑھایا جائے جس کا تعلق اخلاقیات سے ہے۔

۵۔ اخلاقیات ہماری مذہبی تعلیم کا وہ حصہ ہے جو دیگر مذاہب میں بھی اسی طرح سے موجود ہے۔ چنانچہ ایک بچہ جب اخلاقیات سے مذہبی تعلیم کا آغاز کرتا ہے تو اس کے لیے مذہب کوئی اختلافی معاملہ نہیں ہوتا۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ مذہب انسانیت کو ایک وحدت میں پرو سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا یہ حصہ خود اسلامی فرقوں میں بھی متفق علیہ ہے۔ اس لیے پانچویں جماعت تک نہ شیعہ دینیات کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے نہ سنی دینیات کی ضرورت۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

۶۔چھٹی جماعت سے قرآن مجید کی باضابطہ تدریس شروع کر دینی چاہیے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ ابتداعربی زبان کی تعلیم سے کی جائے اور ساتھ ہی قرآن مجید بطور ریڈر داخل نصاب ہو جائے۔اس طرح جب ایک طالب علم بارھویں جماعت سے فارغ ہو تو قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھ چکا ہو اور یوں وہ کتاب اللہ کے متن سے براہ راست وابستہ ہو جائے۔

۷۔اس کے بعد اختصاصی تعلیم شروع ہو جاتی ہے۔اب کوئی ڈاکٹر بنے یا انجینئر اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ساتھ ہی اچھا مسلمان بھی بنے گا۔یہی وہ مرحلہ ہے جہاں اگر کوئی دین کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس میدان میں اختصاص کر سکتا ہے۔جس طرح چار چھ برس کی تعلیم کے بعد ایک فرد ڈاکٹر بنتا ہے، اسی طرح اتنے ہی عرصے کی اعلیٰ تعلیم کے بعد دین کا ایک عالم تیار ہو سکتا ہے۔

۸۔یہ تعلیمی اسکیم اگر پیش نظر رہے تو اس سے نظام ہائے تعلیم کا تفاوت ختم ہو جاتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ملا و مسٹر کی تقسیم باقی نہیں رہتی۔

اس باب میں جاوید صاحب کی جو پہلی مبسوط تحریر میری نظر سے گزری وہ مارچ ۱۹۸۸ میں لکھی گئی۔اس وقت بھی انھوں نے نصاب میں جوہری تبدیلی لائے بغیر اسلامیات کو لازمی مضمون کے طور پر اس کا حصہ بنانے پر تنقید کی تھی۔ انھوں نے لکھا:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

”دینیات کی تعلیم بے شک، اس (نصاب) میں لازم کر دی گئی ہے، لیکن کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر اس عنایت کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ یہ نصاب سراپا تضاد اور اس کے پڑھنے والوں کے دماغ دینی ولا دینی کی رزم گاہ بن گئے ہیں۔ ببول کے درختوں پر انگور کی بیل چڑھانے اور حکایت بادہ و جام سنانے کے بعد زمزم کے فضائل بیان کرنے سے جو کچھ حاصل ہو سکتا ہے، وہی اس نصاب میں دینیات کا پیوند لگانے سے حاصل ہوا ہے۔“ (مقامات ۱۳۰)

گزشتہ اٹھارہ برس میں بہت سے دیگر معاملات کی طرح اس حوالے سے بھی جاوید صاحب کے خیالات میں ارتقا ہوا ہے، لیکن اس سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ موضوع آج پہلی مرتبہ ان کے غور و فکر کا حصہ نہیں بنا، بلکہ برسوں سے وہ اس پر سوچ بچار کرتے آئے ہیں۔اس سے یہ بھی جانا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک اخلاقیات اور مذہب کا باہمی تعلق کیا ہے۔میرا خیال ہے کہ یہ پوری بات اگر کسی نقد و جرح کا موضوع بنے تو اس سے ہمیں اپنے دور کے ایک اہم مسئلے کو سلجھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

ـــــ خورشید ندیم

النساء ـــــ المائدة

۴ ـــــ ۵

یہ دونوں سورتیں اپنے مضمون کے لحاظ سے توام ہیں۔ پہلی سورہ میں جس امت کے لیے صالح معاشرت کی اساسات واضح کی گئی ہیں، دوسری سورہ میں اسی پر اتمام نعمت اور اس کے ساتھ اللہ کے آخری عہد و پیمان کا بیان ہے۔ ان میں خطاب اگرچہ اہل کتاب سے بھی ہوا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی، لیکن دونوں سورتوں کے مخاطب اصلاً مسلمان ہی ہیں۔ ان کے مضمون سے واضح ہے کہ بقرہ و آل عمران کی طرح یہ بھی ہجرت کے بعد مدینہ میں اس وقت نازل ہوئی ہیں، جب مسلمانوں کی ایک باقاعدہ ریاست وہاں قائم ہو چکی تھی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم اہل کتاب پر اتمام حجت اور مسلمانوں کا تزکیہ و تطہیر کر رہے تھے۔

پہلی سورہ ـــــ النساء ـــــ کا موضوع امت مسلمہ کے لیے صالح معاشرت کی اساسات اور اس کا تزکیہ و تطہیر ہے۔

دوسری سورہ ـــــ المائدۃ ـــــ کا موضوع اس امت پر اتمام نعمت اور اس کے ساتھ اللہ، پروردگار عالم کے آخری عہد و پیمان کا بیان ہے۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة النساء

(۱)

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ، وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا، وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً، وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِہٖ وَالْاَرْحَامَ، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا ﴿۱﴾

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

لوگو، اپنے اُس پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اُس کا جوڑا بنایا[۱] اور اِن دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں (دنیا میں) پھیلا دیں۔ اُس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے مدد چاہتے ہو[۲] اور ڈرو رشتوں کے توڑنے سے۔ بے شک، اللہ تم پر نگران ہے[۳]۔ ۱

[۱] اس مفہوم کے لیے اصل میں 'خلق منھا زوجھا' کے الفاظ آئے ہیں۔ انھیں سورۂ نحل (۱۶) کی آیت 'وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا' (۷۲) کی روشنی میں دیکھیے تو ان کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے۔ اسے 'اس میں سے' یا 'اس کے اندر سے' کے معنی میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

[۲] اصل میں لفظ 'تسآء لون' آیا ہے۔ اس کے معنی جس طرح ایک دوسرے سے پوچھنے اور سوال کرنے کے ہیں، اسی طرح ایک دوسرے سے مدد چاہنے کے بھی ہیں۔ یہاں یہ اسی دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

[۳] اس سورہ میں جو ہدایات آگے دی گئی ہیں، یہ آیت ان کے لیے ایک جامع تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کے حقائق اپنی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"پہلی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جس تقویٰ کی ہدایت کی گئی ہے، اس کا ایک خاص موقع و محل ہے۔ اس تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ یہ خلق آپ سے آپ وجود میں نہیں آ گئی ہے، بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو سب کا خالق بھی ہے اور سب کا رب بھی۔ اس وجہ سے کسی کے لیے بھی یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو ایک بے مالک اور بے راعی کا ایک آوارہ گلہ سمجھ کر اس میں دھاندلی مچائے اور اس کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بنائے، بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس کے معاملات میں انصاف اور رحم کی روش اختیار کرے، ورنہ یاد رکھے کہ خدا بڑا از ورآور اور بڑا منتقم و قہار ہے۔ جو اس کی مخلوق کے معاملات میں دھاندلی مچائیں گے، وہ اس کے قہر و غضب سے نہ بچ سکیں گے۔ وہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔

دوسری یہ کہ تمام نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانا ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم و حوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ نسل آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی و عجمی، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں، سب خدا کی مخلوق اور سب آدم کی اولاد ہیں۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے۔ اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں۔

تیسری یہ کہ جس طرح آدم تمام نسل انسانی کے باپ ہیں، اسی طرح حوا تمام نسل انسانی کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حوا کو آدم ہی کی جنس سے بنایا ہے، اس وجہ سے عورت کوئی ذلیل، حقیر، فروتر اور فطری گنہ گار مخلوق نہیں ہے، بلکہ وہ بھی شرف انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔ اس کو حقیر و ذلیل مخلوق سمجھ کر نہ اس کو حقوق سے محروم کیا جا سکتا نہ کم زور خیال کر کے اس کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

چوتھی یہ کہ خدا اور رحم کا واسطہ ہمیشہ سے باہمی تعاون و ہم دردی کا محرک رہا ہے۔ جس کو بھی کسی مشکل یا خطرے سے سابقہ پیش آتا ہے، وہ اس میں دوسروں سے خدا اور رحم کا واسطہ دے کر اپیل کرتا ہے اور یہ اپیل چونکہ فطرت پر مبنی ہے، اس وجہ سے اکثر حالات میں یہ موثر بھی ہوتی ہے۔ لیکن خدا اور رحم کے نام پر حق مانگنے والے اکثر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس طرح ان واسطوں پر حق مانگنا حق ہے، اسی طرح ان کا حق ادا کرنا بھی فرض ہے۔ جو شخص خدا اور رحم کے نام پر لینے کے لیے تو چوکس ہے، لیکن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے، وہ خدا سے دھوکا بازی اور رحم سے بے وفائی کا مجرم ہے اور اس جرم کا ارتکاب وہی کر سکتا ہے جس کا دل تقویٰ کی روح سے خالی ہو۔ خدا اور رحم کے حقوق پہچاننے والے جس طرح ان ناموں سے فائدے اٹھاتے ہیں، اسی طرح ان کی ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں اور درحقیقت حق طلبی و حق شناسی کا یہی توازن ہے جو صحیح اسلامی معاشرے کا اصلی جمال ہے۔ اسی حقیقت کی طرف 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیۡ تَسَآءَ لُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ' کا ٹکڑا اشارہ کر رہا ہے۔" (تدبر قرآن ۲/ ۲۴۶)

[باقی]

طالب محسن

حیا اور ایمان

(مسلم، رقم ۳۶)

عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيهِ سَمِعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا يَعِظُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ. فَقَالَ الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيْمَانِ.

''حضرت سالم اپنے والد رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اپنے بھائی کو حیا پر سمجھاتے ہوئے سنا تو فرمایا: حیا تو ایمان میں سے ہے۔''

بِهٰذَا الْإِسْنَادِ مَرَّ بِرَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ يَعِظُ أَخَاهُ ....

''اسی سند سے (یہ روایت ان الفاظ میں بھی مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم) انصار کے کسی آدمی کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو سمجھا رہا تھا...۔''

لغوی مباحث

یعظ: 'وعظ' کا لفظی مطلب 'نصیحت' ہے، لیکن یہاں یہ اردو کے لفظ 'سمجھانے' کی طرح محل استعمال کے باعث منفی معنی کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ اس روایت کے دوسرے متن میں اسی کے محل پر 'یعاتب'، 'ڈانٹ رہا تھا' کے فعل

سے واضح ہے کہ راوی کی مراد کیا ہے۔

معنی

اس روایت کا بنیادی مضمون پچھلی روایت میں ایک جز کی حیثیت سے زیر بحث آ چکا ہے۔ ایمان کے مظاہر کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے اجزا قرار دیا ہے۔ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن مجید نے کلمۂ طیبہ کے 'اُکُل' (یعنی ثمرات) کی تعبیر اختیار کی ہے۔ ان تعبیرات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا اخلاقی وجود جس اصل پر قائم ہوتا اور پھلتا پھولتا ہے، وہ ایمان ہے۔ ہم نے پچھلی روایت میں حیا کے بارے میں یہ وضاحت کی تھی کہ یہ انسان کے اندر ایک ملکہ ہے جو برائی، غلطی اور گھٹیا پن سے نسبت کے حوالے سے ظاہر ہوتا ہے۔ ایمان اس جذبے کا مؤید بھی ہے اور اس جذبے سے قوت بھی حاصل کرتا ہے۔ ویسے تو حیا کا سب سے نمایاں اظہار جنس کے معاملات میں ہوتا ہے، لیکن حیا ایک صالح انسان کی ایسی خصلت ہے جو اسے ہر طرح کی معصیت کے ارتکاب سے بچنے میں مدد دیتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، حیا کا سب سے بڑا مظہر فواحش سے اجتناب ہے۔ فواحش سے اجتناب نیکیوں کا ایک پورا باب ہے۔ جس شخص میں حیا کا جذبہ زندہ ہے، وہ منکرات کے ایک پورے خاندان سے محفوظ ہو گیا۔ اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا ہے۔

قرآن مجید میں برائیوں کے تین عنوان قائم کیے گئے ہیں۔ سورۂ نحل میں ہے:

يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ. (۹۰:۱۶) ''اللہ تمھیں بے حیائی، برے کاموں اور سرکشی سے روکتا ہے۔''

مولانا امین احسن اصلاحی نے ان کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''...اس (دین) کی منہیات میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کے اندر فحشا، منکر اور بغی کی روح فساد پائی جاتی ہے۔'' (تدبر قرآن ۴/۴۳۸)

ذرا تامل کی نگاہ ڈالیں، انسان کو فحش اور بغی سے بچانے میں حیا کے جذبے کی اہمیت بالکل واضح ہے۔ یعنی حیا کا جذبہ جس طرح بے حیائی کے قول و فعل سے رکنے میں مددگار ہوتا ہے، اسی طرح ایک حیا رکھنے والا آدمی سرکش اور شر کے لیے جری بھی نہیں ہو سکتا۔ منکر کیا ہے، وہ اعمال جن کا برا ہونا سب پر واضح ہے۔ آدمی کا یہ جذبہ کہ اس کے ساتھ برائی کی نسبت نہ ہو یہاں بھی اس کا ہاتھ پکڑتا ہے اور اسے منکر کے ارتکاب سے بچا لیتا ہے۔ غرض یہ کہ حیا کا جذبہ دین کے تمام مناہی کے معاملے میں خدا کی مرضی پر قائم رکھتا ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ یہ روایت

واضح کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ حیا کے جذبے کو نقصان پہنچے۔

متون

امام مسلم رحمہ اللہ نے اس کے دو متن منتخب کیے ہیں۔ ان میں اختلاف محض بیان واقعہ کے طریقے میں ہے۔ ایک میں بیان ہوا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو اپنے بھائی کو ڈانٹتے ہوئے سنا تو اسے کہا کہ حیا ایمان سے ہے۔ دوسرے میں بیان ہوا ہے کہ حضور انصار کے ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو ڈانٹ رہا تھا تو آپ نے فرمایا:...۔ عام طور پر یہ جملہ معمولی فرق کے ساتھ انھی دو طریقوں سے نقل ہوا ہے۔ دوسرا جملہ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی کم وبیش انھی الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ یعنی عام طور پر 'الحیاء من الایمان' کے الفاظ ہی میں حضور کی بات بیان ہوئی ہے۔ البتہ بعض راویوں نے اسی جملے میں 'شعبۃ' کا لفظ بھی شامل کیا ہے۔ بخاری میں اسی روایت کا قدرے تفصیلی متن منقول ہوا ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا: مَرَّ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى رَجُلٍ وَهُوَ يُعَاتِبُ اَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ. يَقُولُ: اِنَّكَ لَتَسْتَحْيِي حَتّٰى كَاَنَّهُ يَقُولُ: قَدْ اَضَرَّ بِكَ. فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: دَعْهُ، فَاِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيْمَانِ. (رقم ۵۷۶۷)

''حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے جو اپنے بھائی کو شرم کرنے پر ڈانٹ رہا تھا۔ کہہ رہا تھا: تم بہت شرماتے ہو۔ گویا کہ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ تمھاری اسی خصلت نے تمھیں نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کہا: اس کے پیچھے نہ پڑو کیونکہ حیا ایمان میں سے ہے۔''

ان روایات سے یہی بات سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ بات سر راہ صادر ہوئی تھی۔ لیکن معجم کبیر میں اس سے ملتا جلتا ایک واقعہ لوگوں کے حضور کے پاس آنے کو بیان کرتا ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: جَاءَ قَوْمٌ اِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِصَاحِبِهِمْ. فَقَالُوا: يَا نَبِيَّ اللّٰهِ، اِنَّ صَاحِبَنَا هٰذَا قَدْ اَفْسَدَهُ الْحَيَاءُ. فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ الْحَيَاءَ مِنْ شَرَائِعِ الْاِسْلَامِ

''حضرت عبد اللہ بیان کرتے ہیں کہ کچھ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنے ایک ساتھی کو لے کر حاضر ہوئے۔ عرض کی: اے اللہ کے نبی، یہ ہمارا ساتھی، شرم نے اسے برباد کیا ہوا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حیا اسلام کے ضوابط میں سے ہے۔

وَاِنَّ البَذَاءَ مِنْ لُؤْمِ الْمَرْءِ. (رقم ۱۰۵۰۶)　　　فحش گوئی آدمی کے لیے کلنک ہے۔''

کتابیات

موطا، رقم ۱۶۱۱۔ بخاری، رقم ۲۴، ۵۷۶۷۔ مسلم، رقم ۳۶۔ ابوداؤد، رقم ۴۷۹۵۔ ترمذی، رقم ۲۶۱۵۔ ابن ماجہ، رقم ۵۸۔ نسائی، رقم ۵۰۳۳۔ احمد، رقم ۴۵۵۴، ۵۱۸۳، ۶۳۴۱۔ ابن حبان، رقم ۶۱۰۔ سنن کبریٰ، رقم ۱۱۷۶۴۔ بیہقی، رقم ۲۰۵۹۷۔ معجم کبیر، رقم ۱۰۵۰۶۔

---

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معز امجد

قریش کے بارے میں ایک روایت

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

روایت کا مضمون

عبدالرزاق، رقم ۱۹۸۹۶ کے مطابق بیان کیا جاتا ہے:

روی أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال: صلب الناس قریش وھل یمشی الرجل بغیر صلب؟

''روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگوں کی ریڑھ کی ہڈی قریش ہیں تو کیا ریڑھ کی ہڈی کے بغیر لوگ چل سکتے ہیں؟''

یہ روایت بعض اختلافات اور اضافوں کے ساتھ احمد بن حنبل، رقم ۲۴۵۰۱ اور معجم الاوسط، رقم ۳۰۶۶ میں بھی نقل ہوئی ہے۔

روایت پر تبصرہ

مذکورہ بالا روایات میں سے دو روایات قابل اعتماد راویوں سے روایت نہیں ہوئیں، جبکہ تیسری روایت کی سند منقطع ہے۔ عبدالرزاق کی روایت زید بن اسلم نے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے، حالانکہ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس روایت کو نہیں سنا، اس لیے یہ سند منقطع ہے۔ احمد بن حنبل اور معجم الاوسط کی روایات کو ایک

ہی راوی عبداللہ بن المؤمل نے نقل کیا ہے جس کے بارے میں اہل علم کی رائے یہ ہے کہ وہ قابل اعتماد راوی نہیں ہے[1]۔

نتیجۂ بحث

یہ روایت چونکہ کسی قابل اعتماد سند سے نقل نہیں ہوئی، اس لیے اس کے بارے میں یہ بات اعتماد کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت درست ہے۔

تخریج: محمد اسلم نجمی

کوکب شہزاد

ترجمہ و ترتیب: اظہار احمد

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

1. تفصیل کے لیے دیکھیے: الضعفاء الکبیر ۲/ ۳۰۲، الکامل فی الضعفاء ۴/ ۱۳۵، المجروحین ۲/ ۲۷، الضعفاء لنسائی ۱/ ۶۲، تقریب التہذیب ۱/ ۳۲۵، تہذیب الکمال ۱۶/ ۱۸۷، تہذیب التہذیب ۶/ ۴۲، الکاشف ۱/ ۶۰۱، الجرح والتعدیل ۵/ ۱۷۵۔

جاوید احمد غامدی

ایمانیات

(۷)

(گزشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

صفات

اللہ تعالیٰ کی صفات، البتہ کسی نہ کسی درجے میں انسان کی گرفت میں آتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ صفات سے متعلق کچھ چیزیں، خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہوں، انسان کے پاس بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے علم و خبر، قدرت، ربوبیت اور رحمت و حکمت سے کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرمایا ہے۔ اس پر قیاس کر کے خدا کی ان صفات کا کچھ تصور ہم قائم کر سکتے ہیں۔ یہ بات اس طرح بھی سمجھی جا سکتی ہے کہ انسان کا وجود محض انفعال ہے۔ یہ جس فعل کا اثر ہے، وہ ارادہ، قول، مشیت، کلمہ اور امر ہے جو فاعل حقیقی سے صادر ہوتا ہے۔[۳۸] شے کی حقیقت یہی ارادہ ہے۔ اسے شے کا نام اسی سے ملا ہے۔ اس میں جو صفات ظاہر ہوتی ہیں، وہ درحقیقت اسی کلمے کی صفات ہیں۔ انسان کے وجود کی حقیقت بھی یہی ہے۔ پھر وہ اپنے وجود کا شعور رکھتا ہے، اس لیے اپنے فاعل کی صفات بھی کسی حد تک سمجھ لیتا ہے۔ تاہم اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی عقل کو بیدار رکھے اور وحی الٰہی کی رہنمائی میں انفس و آفاق کے اندر خدا کی آیات پر غور کرتا رہے۔ قرآن نے اپنے مخاطبین کو اسی بنا پر بار بار تعقل، تفکر اور تذکر کی دعوت دی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی

۳۸؎ سورۂ یٰس (۳۶) کی یہ آیت اسی حقیقت کا بیان ہے: 'اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ'۔ (۸۲) ''اس کا معاملہ بس یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔''

نے ان تعبیرات کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''تعقل کا منشا یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی کے معاملات میں محض جذبات، شہوات اور خواہشات کو اپنا رہنما نہ بنا لے اور نہ اوہام وخیالات کے ہاتھ میں اپنی باگ دے بیٹھے، بلکہ اس کے اندر خدا نے جو عقل رکھی ہے، اس کو رہنما بنائے اور اس کی رہنمائی پر اعتماد کرے۔

تفکر کا مطلب یہ ہے کہ نظام عالم کے قوانین واحکام اور فطرت انسانی کے مطالبات اور تقاضوں پر حکیمانہ طور پر غور کیا جائے اور ان سے زندگی کے لیے جو اصول پیدا ہوتے ہیں، ان کو پوری سچائی اور ایمان داری کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔

تذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن بدیہیات پر یقین رکھتا ہے، ان بدیہیات کو جذبات وشہوات کی ہلچل کے اندر بھی یاد رکھے، اور پھر ان سے بالکل لازمی طور پر جو نتائج نکلتے ہیں، ان کو بھی بغیر کسی ہچکچاہٹ کے تسلیم کرے۔''

(تزکیۂ نفس ۹۲)

اس طریقے سے غور کیا جائے تو انفس وآفاق کی ہر چیز گواہی دیتی ہے کہ خدا محض علت العلل اور واجب الوجود نہیں ہے کہ جس سے سلسلۂ علت ومعلول شروع ہوا اور جو ہر حال میں تھا اور ہے اور رہے گا، بلکہ ایک ایسی صاحب ارادہ وادراک ہستی ہے جو تمام اعلیٰ صفات کی حامل ہے۔

ہم یہاں اس کی وضاحت کریں گے:

۱۔ مادہ ارادے سے خالی ہے۔ وہ علم وعقل سے بھی خالی ہے۔ نفس کا علم وارادہ اور دوسرے قویٰ بھی اس کے ضعف ونسیان اور قلت عزیمت کی وجہ سے اس کے ذاتی نہیں ہو سکتے۔ لیکن دونوں سے ایسے غیر معمولی فوائد اور عجیب وغریب تغیرات پیدا ہوتے ہیں جو کوئی اندھی اور بہری طاقت ہرگز پیدا نہیں کر سکتی۔ لہٰذا دونوں مخلوق ہیں اور ہر مخلوق اپنے لیے ایک خالق کا تقاضا کرتی ہے:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ، اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ؟ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ؟ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ. (الطّور ۵۲: ۳۵-۳۶)

''یہ بغیر کسی خالق کے پیدا ہو گئے ہیں یا آپ ہی اپنے خالق ہیں؟ کیا زمین وآسمان کو انھی نے پیدا کیا ہے؟ (نہیں)، بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) یہ یقین نہیں رکھتے۔''

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ، خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ. (المومن ۴۰: ۶۲)

''وہی اللہ تمھارا پروردگار ہے، ہر چیز کا خالق، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پھر کہاں اوندھے ہو جاتے ہو؟''

۲۔ زمین و آسمان کا یہ خالق کسی چیز کا محتاج نہیں ہو سکتا، اس لیے خلق کی ایک ہی علت ہے اور وہ اس کا ارادۂ رحمت ہے۔ اس نے جب چاہا کہ انعام کرے تو اس نے دنیا بنا دی اور اس میں اپنی مخلوق کو وہ نعمتیں دیں جو شمار نہیں ہو سکتیں۔ چنانچہ اس کا نام جس طرح اللہ ہے، اسی طرح رحمٰن بھی ہے:

اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ، اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ، وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ، وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ، اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ، وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ، وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ، فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ، وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ. (الرحمٰن ۵۵: ۱-۱۳)

''رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی۔ (اِس لیے کہ) اُس نے انسان کو پیدا کیا۔ اسے نطق و بیان کی صلاحیت دی۔ (تم ذرا نظر اٹھا کر دیکھو،) یہ سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ گردش میں ہیں اور تارے اور درخت، سب سجدہ ریز ہیں۔ اور اُس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس میں میزان قائم کی کہ تم بھی میزان میں خلل نہ ڈالو۔ اور انصاف کے ساتھ سیدھی تول تولو اور وزن میں کمی نہ کرو۔ اور اپنی خلقت کے لیے اُس نے یہ زمین بنائی ہے۔ اس میں میوے ہیں اور کھجور کے درخت ہیں، جن کے پھل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، اور طرح طرح کے غلے ہیں جن پر بھوسی کے خول ہیں اور خوشبو والے پھول ہیں —— پھر اے جن و انس، تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے!''

۳۔ علم محض قوت ہی کا علم ہے، لہٰذا ہر علم قوت کی گواہی ہے۔ یہ قوت اگر کسی صاحب ارادہ و ادراک ہستی کی طرف سے نہ ہو تو اسے جبر محض ہونا چاہیے، مگر عالم کا نظم و ترتیب اور اس کی اتھاہ معنویت اس کی تردید کرتی ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی علم و عقل کے تصرف کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا خالق محض قدیر ہی نہیں، وہ علیم و حکیم بھی ہے:

قُلْ: اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ، وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا، ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا، وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ،

''ان سے پوچھو، کیا تم اُس ہستی کے منکر ہو رہے ہو اور اُس کے شریک ٹھیراتے ہو جس نے دو دن میں زمین بنا دی؟ وہی تو عالم کا پروردگار ہے۔ اور (زمین کو وجود میں لانے کے بعد) اُس کے اوپر سے پہاڑ جما دیے اور اُس میں برکتیں رکھ دیں اور تمام ضرورت مندوں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ، وَھِیَ دُخَانٌ، فَقَالَ لَھَا وَلِلْاَرْضِ: ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا، قَالَتَآ: اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ، فَقَضٰھُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ، وَاَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَھَا، وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ، وَحِفْظًا، ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ. (حم السجدہ ۴۱: ۹-۱۲)

کے لیے اُن کی ضرورت کے مطابق ٹھیک اندازے سے اُس میں خوراک کے ذخیرے رکھ دیے، سب ملا کر چار دنوں میں۔ پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ اُس وقت دھوئیں کی صورت میں تھا۔ پھر اُس سے اور زمین سے کہا: دونوں حکم کی تعمیل کرو، خواہ تم چاہو یا نہ چاہو۔ دونوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ تب اُس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا اور آسمان زیریں کو چراغوں سے آراستہ کیا اور پوری طرح محفوظ بنا دیا۔ یہ سب خداے عزیز و علیم کا منصوبہ ہے۔''

۴۔ انفس و آفاق کا قیام و انصرام ایک حقیقت ہے۔ یہ کسی زندہ اور قائم ہستی کے بغیر ہرگز متصور نہیں ہو سکتا۔ اس لیے خالق زندہ اور قائم، بلکہ سب کو قائم رکھنے والا بھی ہے:

اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ، لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ، لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ، مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ، یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ، وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ، وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ، وَلَا یَئُوْدُہٗ حِفْظُھُمَا، وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ. (البقرہ ۲: ۲۵۵)

''اللہ جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، زندہ اور سب کو قائم رکھنے والا۔ نہ اُس کو نیند آتی ہے نہ اونگھ لاحق ہوتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اُس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کسی کی سفارش کرے۔ لوگوں کے آگے اور پیچھے کی ہر چیز سے واقف ہے اور اُس کی مرضی کے بغیر وہ اُس کے علم میں سے کسی چیز کو بھی اپنی گرفت میں نہیں لے سکتے۔ اُس کی بادشاہی زمین و آسمان پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں ہوتی، اور وہ بلند ہے، بڑی عظمت والا ہے۔''

۵۔ زمان کیا ہے؟ یہ اسی حی و قیوم خالق کی صفت بقا سے منتزع ایک تصور ہے۔ لہٰذا وہ اول ہے، اس سے پہلے کچھ نہیں ہے؛ وہ آخر ہے، اس کے بعد بھی کچھ نہیں ہے؛ وہ ظاہر ہے، اس سے اوپر کچھ نہیں ہے؛ وہ باطن ہے، اس سے نیچے

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

بھی کچھ نہیں ہے۔ وہ زمان و مکان سے محدود نہیں ہو سکتا۔ اس کا علم، البتہ زمان و مکان، دونوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ، وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ، وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. (الحدید ۵۷:۳)

''وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، وہی ظاہر بھی ہے اور باطن بھی، اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

۶۔ صفات کے بغیر ذات کا تصور محض مفروضہ ہے۔ اس سے متعلق جو نزاعات بالعموم ہوئے ہیں، وہ سب لفظی ہیں۔ چنانچہ تمام صفات حسنہ: خلق، عدل، رحمت، رأفت اور علم و حکمت، اللہ تعالیٰ کے ذاتی محاسن کی حیثیت سے اس کے لیے ثابت اور اپنے آثار سے مقدم ہیں، اس لیے کہ شے کی علت ہمیشہ اس سے مقدم ہوتی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے کہ اس دنیا کے فنا ہو جانے کے بعد بھی خدا کا جلال و اکرام پوری شان کے ساتھ باقی ہوگا:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ. (الرحمٰن ۵۵:۲۶-۲۷)

''زمین پر جو بھی ہے، سب فانی ہے اور تیرے پروردگار کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے۔''

۷۔ صفات الٰہی کے سمجھنے میں ان کی جہت حسن، البتہ ملحوظ رہنی چاہیے، اس لیے کہ قدرت اسی وقت مدح کی مستحق ہے، جب وہ رحمت، کرم اور عدالت کے ساتھ ہو۔ غصے، انتقام اور قہر و غضب کا ظہور بھی ظلم و عدوان کے خلاف ہو تو قابل تحسین ہے۔ رحمت، مغفرت اور جود و کرم بھی اپنے محل ہی میں تعریف کے مستحق ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں غنی کے ساتھ حمید، علیم کے ساتھ حکیم اور عزیز کے ساتھ غفور کی صفات اسی جہت حسن کی طرف رہنمائی کے لیے آئی ہیں:

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى، فَادْعُوْهُ بِهَا، وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ، سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. (الاعراف ۷:۱۸۰)

''اور اللہ کے لیے تو صرف اچھے نام ہیں، اُس کو انھی سے پکارو اور اُن لوگوں کو چھوڑ و جو اُس کی صفات کے معاملے میں کج روی اختیار کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، عنقریب اُس کا بدلہ پا لیں گے۔''

۸۔ اللہ تعالیٰ کا جو تصور بھی قائم کیا جائے گا، وہ جلال و جمال اور کمال سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ 'الواحد'، 'الاحد'، 'الصمد'، مثال کے طور پر صفات کمال ہیں۔ 'القدوس'، 'السلام'، 'المومن' صفات جمال اور 'الملك'، 'العزيز'، 'الجبار' صفات جلال ہیں۔ انسان کے دل میں صفات جلال سے خوف، تعظیم اور مدح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور صفات جمال سے حمد، رجا اور محبت کے۔ پھر صفات جلال حواس کے لیے زیادہ ظاہر اور صفات جمال عقل و دل کے زیادہ قریب ہوتی ہیں۔ پروردگار کو سامنے رکھا جائے تو صفات جمال کا غلبہ محسوس ہوتا ہے اور نفس انسانی نگاہوں کے سامنے ہو تو جلال کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ انسان خدا سے ڈر کر اسی بنا پر خدا ہی کی طرف لپکتا اور اس کی صفات جمال کے دامن میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

'اللھم اعوذ بك منك'[39] کے الفاظ اسی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔ یہ اس بندے کی دعا ہے جو اپنے پروردگار کی محبت سے سرشار ہے، اس کے استغنا اور کبریائی سے لرزاں ہے، اس سے ملاقات کا مشتاق ہے اور اس کے فیصلوں کے سامنے پورے ادب کے ساتھ سرنگوں ہے۔ قرآن مجید جب یہ کہتا ہے کہ تمام اچھے نام اسی کے ہیں تو اس کے معنی اس کے نزدیک یہی ہوتے ہیں کہ ہر وہ نام جو خدا کے جلال و جمال اور اس کے کمال کو بیان کرتا ہے، وہ اچھا ہے اور اس سے خدا کو پکارا جا سکتا ہے:

قُلِ: ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ، اَيًّا مَّا تَدْعُوْا، فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى.

''کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔''

(بنی اسرائیل ۱۷: ۱۱۰)

امام حمید الدین فراہی نے ان مباحث کی تفصیل کے بعد اپنی کتاب ''القائد الی عیون العقائد'' میں لکھا ہے:

''... پروردگار کا تصور تمھارے دل میں ایک ایسی ہستی کا تصور ہونا چاہیے جو کریم ہے، رحیم ہے، عفو و درگزر کرنے والا ہے، بخشنے والا ہے، کمال حسن و رأفت کے ساتھ ہنستا مسکراتا اور نرمی برتنے والا ہے، سب کریموں سے بڑھ کر کریم اور سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے، وہ تمھارا مددگار ہے اور تمھارے دشمنوں سے انتقام لیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ تم اس سے تسکین حاصل کرو، اس کا قرب تلاش کرو اور اس سے ملاقات کے مشتاق رہو۔ پھر تم جانتے ہو کہ وہ قدوس بھی ہے اور سراسر حق بھی، لہٰذا عقلاً محال ہے کہ وہ اچھے اور برے میں فرق نہ کرے اور کوئی خبیث، غلیظ، ظالم، معاند، بھلائی سے روکنے اور حدود سے تجاوز کرنے والا، شک میں پڑا ہوا، اور حق و خیر کی مخالفت پر اصرار کرنے والا اس کا قرب حاصل کر لے۔ ہاں، وہ اپنے اس بندے پر رحم فرماتا اور اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے جو اس سے رجوع کرتا اور برائی کو چھوڑ کر بھلائی کا رویہ اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اس کے کمال عظمت و کبریائی کو ہمیشہ یاد رکھتا ہے تاکہ اس کا ادب ملحوظ رکھے، اس کے حضور میں جھکا رہے اور جان رکھے کہ وہ عالم سے غنی ہے، اسے مخلوقات میں سے کسی کی احتیاج نہیں، وہ تدبیر امور میں نہایت عالی مرتبہ ہے۔ پھر اس کے باوجود کہ اس کا ہر فیصلہ سراسر حق اور سراسر رحمت ہے، اس کی مخلوقات اس میں سے اتنا ہی جانتی ہیں، جتنا ان کے لیے موزوں ہے۔ چنانچہ ضروری ہے کہ اس کے فیصلے تسلیم کیے جائیں اور اس کے بندے اس کے ہر امر و نہی پر راضی رہیں۔'' (۴۳)

[باقی]

---

[39] مسلم، رقم ۴۸۶۔ ''اے اللہ، میں تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

محمد اسلم صدیق

انجیل کی زبان؛ ایک ناقدانہ جائزہ

[''اشراق''، دسمبر ۲۰۰۵ میں ''سریانی وارامی زبان کے بارے میں وضاحت'' کے زیرعنوان المورد، ادارۂ علم وتحقیق کے فیلو جناب عبدالستار صاحب غوری کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں شائع ہونے والی اس رائے پر تنقید کی گئی تھی کہ: ''انجیل سریانی زبان میں تھی۔'' ماہنامہ ''محدث'' نے مارچ ۲۰۰۶ کے شمارے میں اس تنقید پر تبصرہ کرتے ہوئے ''انجیل کی زبان؛ ایک ناقدانہ جائزہ'' کے زیرعنوان ایک مضمون شائع کیا ہے۔ ''محدث'' کا یہ مضمون اوراس پر غوری صاحب کا تنقیدی مقالہ شامل اشاعت ہے۔ مدیر]

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

ماہنامہ 'الاعتصام' (۲ تا ۸ ستمبر ۲۰۰۵ء) میں ایک سوال کے جواب میں حافظ ثناءاللہ مدنی صاحب نے علامہ قسطلانی کے حوالہ سے سریانی زبان کے وجود کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ''انجیل سریانی زبان میں تھی۔'' جس پر المورد کے ریسرچ فیلو عبدالستار غوری صاحب نے ماہنامہ 'اشراق' (دسمبر ۲۰۰۵ء) میں اس موقف کی تردید کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ:

> ''انجیل ابتدا ہی سے یونانی (Greek) زبان میں لکھی گئی تھی۔ جبکہ حضرت مسیح کی زبان ارامی (Aramaic) تھی اور انھوں نے اپنے مواعظ و بشارات اسی ارامی زبان میں ارشاد فرمائے تھے۔ لیکن ان کے جو ارشادات بائبل کے عہد نامہ جدید کی چاروں انجیلوں اور دیگر تحریروں میں درج ہیں، وہ کبھی بھی اپنی اصلی حالت میں (ارامی زبان میں) نہیں لکھے گئے تھے... وہ شروع ہی سے یونانی زبان میں لکھے گئے تھے۔''

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''جہاں تک دوسرے حصے کا تعلق ہے کہ 'انجیل سریانی زبان میں تھی'، تو یہ بات سراسر غلط ہے۔'' (صفحہ ۳۵)

زیر نظر سطور میں ہم پہلے اس بات کا جائزہ لیں گے کہ کیا واقعی انجیل کی اصل زبان آرامی تھی؟ اور پھر بتائیں گے کہ اناجیل کا سب سے پہلے یونانی زبان میں لکھے جانے کا دعویٰ کس حد تک درست ہے؟

علمی دنیا میں یہ امر کسی سے مخفی نہیں کہ جس انجیل کا ذکر قرآن مجید کے تقریباً ۱۲ مقامات پر ہوا ہے، اس سے مراد وہ اصل کتاب یا الٰہی احکام ہیں جو حضرت عیسیٰؑ پر بذریعہ وحی نازل ہوئے تھے اور عہد نامہ جدید (New Testament) کی اناجیل کے فرضی مجموعے، وہ انجیل نہیں ہے جس کا ذکر قرآن میں ہوا ہے۔ یہ انجیل اس وقت اپنی اصل شکل میں دنیا میں کہیں موجود نہیں ہے۔ اب یہ سوال کہ اس اصل انجیل کی زبان کیا تھی؟

اس بارے میں اس حد تک تو واضح ہے کہ انجیل کی اصل زبان وہی تھی جو حضرت عیسیٰؑ اور ان کی قوم کی زبان تھی، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِه﴾ لیکن حضرت عیسیٰ اور ان کی قوم کی زبان کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ اصل انجیل اب دنیا کے نقشہ پر موجود نہیں ہے، نہ ہی کوئی ایسا ٹھوس تاریخی ثبوت یا دستاویز موجود ہے جس سے حضرت عیسیٰ اور ان کی قوم کی زبان کا حتمی تعین کیا جا سکے۔ اس حوالہ سے اگر ہمارے پاس کچھ ہے تو وہ صرف بعض مغربی ماہرین اور مسلم محققین کی آرا ہیں جن میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

ذیل میں اختصار کے ساتھ ان اختلافی آرا کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے:

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۵۰ء، ۵۲۲/۳) میں ہے کہ ''مسیح اور آپ کے حواری نسلاً اور مذہباً اسرائیلی تھے اور ان کی مادری و مذہبی زبان عبرانی تھی یا مغربی آرامی۔'' (Jesus، ص ۴۸) ـــــ امریکہ کے یونین کالج میں عبرانی کے پروفیسر Moss Buttenwieser کے بقول حضرت عیسیٰؑ کے دور میں آرامی زبان بولی جاتی تھی ـــــ مغربی مفکر Renen کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی مادری، مذہبی اور وطنی زبان عبرانی آمیز سریانی تھی۔

نیز اردو دائرہ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) کے مقالہ نگار نے مادہ انجیل کے تحت لکھا ہے کہ انجیل کی زبان آرامی یا آرامی کی کوئی شاخ تھی۔ علامہ بدرالدین عینیؒ نے صحیح بخاری کی حدیث کے الفاظ 'كان ورقة بن نوفل يكتب الكتاب فيكتب من الانجيل بالعبرانية' کے تحت لکھا ہے کہ:

> قال التيمي: الكلام العبراني هو الذي أنزل به جميع الكتب كالتوراة والانجيل ونحوهما وقال الكرماني: فهم منه ان الانجيل عبراني، قلت: ليس كذلك، بل التوراة عبرانية والانجيل سرياني. (عمدۃ القاری ۵۲/۱)

''امام تیمی کہتے ہیں کہ عبرانی وہ کلام (زبان) ہے جس میں تورات، انجیل وغیرہ کتب کو نازل کیا گیا تھا۔ امام کرمانی

کہتے ہیں کہ اس سے سمجھ آتا ہے کہ انجیل عبرانی زبان میں تھی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات درست نہیں، بلکہ تورات عبرانی میں تھی اور انجیل سریانی زبان میں تھی۔''

اور مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب 'نصرانیت؛ قرآن کی روشنی میں' ص ۹۲ پر صاف لکھا ہے کہ ''حضرت عیسیٰ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان سریانی تھی۔''

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں انجیل کی اصل زبان کے متعلق پانچ آراء ہمارے سامنے آتی ہیں: عبرانی، سریانی، عبرانی آمیز سریانی، آرامی یا آرامی کی کوئی شاخ۔ ان مختلف آرا سے کم ازکم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ انجیل کی زبان کو آرامی قرار دینے کا جو بلند و بانگ دعویٰ کیا گیا ہے، وہ کوئی مسلمہ حقیقت نہیں رکھتا۔

اب ہم یہ جائزہ لیں گے کہ ان میں سے کون سی رائے دلائل کی رو سے زیادہ قرین قیاس ہے؟

اس سلسلہ میں جب ہم زبانوں کی تاریخ اور ان مذکورہ آرا کے تناظر میں دیکھتے ہیں تو اصل انجیل کا آرامی زبان میں ہونے کا دعویٰ کسی طور بھی درست اور تاریخی تناظر سے ہم آہنگ معلوم نہیں ہوتا۔ اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اسرائیلیوں کی اصل مادری اور مذہبی زبان عبرانی تھی۔ اور آرامی ایک شمال مغربی سامی Semtic زبان تھی جو عبرانی سے بہت مماثلت رکھتی ہے۔ جب ایرانی شہنشاہ Cyprus نے بابلی سلطنت پر قبضہ کر لیا تو آرامی زبان کو ان اسرائیلیوں پر سرکاری زبان کے طور پر رائج کر دیا اور پھر آرامی زبان ان میں اس طرح رچ بس گئی کہ فلسطین کے علاقے یہودیہ Judaea میں تو یہ تقریباً ۷۰۰ سو سال تک یہودیوں کی مقامی روزمرہ کی زبان رہی اور یہودی فقہ تالمود کی بعض کتابیں بھی آرامی زبان میں لکھی گئی تھیں۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ اسرائیلیوں کی اصل مادری اور مذہبی زبان عبرانی تھی۔ پھر جب ایرانی شہنشاہ Cyprus کے بابلی سلطنت پر تسلط کی وجہ سے آرامی زبان کو سرکاری سرپرستی میں ان پر نافذ کر دیا گیا تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ محکوم عبرانی زبان اس بیرونی آرامی زبان کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتی تھی۔ تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ عبرانی اور آرامی زبان کے اس باہم امتزاج سے سریانی زبان پروان چڑھی اور حضرت عیسیٰ کی آمد سے پہلے اسرائیلیوں میں رائج ہو گئی اور بعد میں آرامی کی ایک شاخ کے طور پر متعارف ہوئی۔

تاریخ کے اس تناظر میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ اور ان کے حواریوں کی مادری زبان نہ تو خالص عبرانی تھی اور نہ ہی آرامی، بلکہ وہ عبرانی اور آرامی آمیز سریانی تھی اور یہی درحقیقت انجیل کی اصل زبان تھی جسے Renen نے عبرانی آمیز سریانی سے تعبیر کیا ہے۔ اور خود المورد کے فیلو نے بھی تسلیم کیا ہے کہ ''ارامی ایک وسیع

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

زبان ہے...سریانی درحقیقت آرامی کی ذیلی بولی (Dialect) ہے۔‘‘

نیز انجیل کی زبان آرامی اس لئے بھی نہیں ہوسکتی کہ یہ خالص غیر اسرائیلیوں کی زبان تھی جسے ایرانی بادشاہ Cyprus نے ان پر مسلط کر دیا تھا۔ اسرائیلی اس مسلط کردہ زبان کو اپنی مذہبی زبان کے طور پر قطعاً قبول نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا اس زبان کو انجیل اور حضرت عیسیٰ کی مذہبی زبان بنایا جانا قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔ اور جن لوگوں نے اسے آرامی قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ بعد میں سریانی زبان آرامی کی ذیلی بولی یا اس کی شاخ کے طور پر معروف ہوگئی تھی اور بعض لوگوں نے اس شاخ کو اصل سے تعبیر کر دیا۔ شاید محکومیت کا اثر تھا کہ سریانی اپنا الگ تشخص قائم نہ کرسکی۔

حقیقت یہ ہے کہ سریانی اس دور کی ابھرتی ہوئی زبان تھی۔ پھر بعد میں انجیل کے اس زبان میں نازل ہونے کی وجہ سے اسے مسیحیوں کی مذہبی زبان کی حیثیت بھی حاصل ہوگئی، جس کے نتیجے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد تک یہ ارض مقدس کے تمام علاقوں کی روزمرہ، بول چال اور عوامی رابطوں کی زبان بن چکی تھی۔ اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس عیسائی وفود آتے تو ان سے گفتگو اور تبلیغ میں مشکل پیش آتی جس کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید کو سریانی سیکھنے کا حکم فرمایا۔ تو گویا سریانی زبان کے ان علاقوں میں پھیل جانے کے پیچھے بنیادی محرک یہی تھا کہ یہی انجیل کی اصل زبان تھی اور عیسائیوں کی مذہبی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی تھی، جیسا کہ خود 'اشراق' کے مضمون نگار نے بھی لکھا ہے کہ

> ’’یہ (سریانی) اس علاقے میں حضرت عیسیٰ کی آمد سے پہلے بھی رائج تھی۔ ۴۵۱ء کی کونسل کے مباحث کے بعد ارامی بولنے والے اکثر وبیشتر مسیحیوں نے سریانی کو اپنی کلیسائی اور ثقافتی زبان کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس سے ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے مذہب وثقافت کو بازنطینی اثرات سے بچاسکیں۔‘‘

یہاں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسیحیوں کو اپنے مذہب وثقافت کو بازنطینی اثرات سے بچانے کی فکر آخر کیوں دامن گیر ہوئی؟ اس کی وجہ یقیناً یہی تھی کہ مسیحیوں کا مذہبی اور ثقافتی ورثہ (انجیل) سریانی زبان میں تھا، اسی لئے ہی تو انہوں نے سریانی زبان کو اپنی کلیسائی اور ثقافتی زبان کے طور پر اختیار کیا تھا۔ اور آرامی زبان تو بازنطینی حکومت کی زبان تھی اور جسے عیسائی دنیا اپنے مذہب وثقافت کے لئے خطرہ سمجھ کر ترک کر رہی تھی، اسی زبان میں ان کی مذہبی کتاب انجیل کا نازل ہونا انتہائی تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ انجیل جو عیسائی مذہب وثقافت کا مصدر وماخذ تھی، اگر آرامی زبان میں نازل ہوئی ہوتی تو عیسائی دنیا کبھی اس کے اثرات سے اپنے مذہب کو بچانے کی فکر نہ کرتی، بلکہ اسے مقدس سمجھ کر

بام عروج تک پہنچاتی۔ تو خود اشراق کے مضمون نگار کی مذکورہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ انجیل کی اصل زبان آرامی نہیں، بلکہ سریانی تھی۔

چنانچہ صحیح بخاری کے شارح بدرالدین عینیؒ نے واضح طور پر انجیل کی زبان کو سریانی قرار دیا ہے، لکھتے ہیں 'لیس كذلك بل التوراة عبرانية والانجيل سرياني.'

اس کے علاوہ مغربی مفکر Renen، مولانا مودودی اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار کی عبارات بھی اسی موقف کی ہم نوائی کر رہی ہیں۔ اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ مسیحی سوسائٹی Watch Tower کی مطبوعہ بائبل، طبع نیویارک کے دیباچے (ص viii) میں بھی مذکور ہے کہ ''اصل انجیل سریانی زبان میں تھی۔''

افسوس! اگر المورد کے محترم فیلو نے ''کسی متعلقہ صاحب علم یا متعلقہ کتب سے رجوع'' کیا ہوتا جو شاید ''اتنا دشوار نہ تھا'' تو وہ ہرگز ''علامہ قسطلانیؒ جیسے فاضل محقق'' کے اس جملے کہ انجیل سریانی زبان میں تھی کو ''سراسر غلط'' قرار نہ دیتے اور نہ ہی اس قدر علمی تفوق اور احساس برتری سے لبریز لب و لہجہ میں علامہ قسطلانی اور مولانا مدنی کو متعلقہ صاحب علم یا متعلقہ کتب سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتے۔

ایک ایسا مسئلہ جو متعلقہ اہل علم کے درمیان بھی اختلافی ہے اور کوئی ایسا ٹھوس تاریخی ثبوت یا دستاویز بھی موجود نہیں جس سے ثابت ہو کہ انجیل کی اصل زبان آرامی تھی، کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنا اور مخالف کی رائے کو سراسر غلط قرار دینا انتہائی غیر معروضی انداز تحقیق ہے جو استشراقیت و جدت کے علمبردار 'المورد' کے 'علما' کو ہی لائق ہے۔

پھر افسوس ناک امر یہ ہے کہ مقالہ نگار نے اپنی ''اس تحریر کو جان بوجھ کر حوالوں سے گرانبار'' کرنا تو مناسب نہیں سمجھا، لیکن طنز و تعلّی اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں تین چار صفحات سیاہ کر دیے ہیں، اگر وہ اس سلسلہ میں کوئی ایک مستند حوالہ یا کوئی ٹھوس تاریخی ثبوت پیش کر دیتے تو قارئین کے لیے تحقیق کی راہ آسان ہو جاتی۔

اس کے علاوہ غوری صاحب کا مولانا مدنی کو علامہ قسطلانیؒ پر اندھا اعتماد کرنے کا طعنہ دینا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ مولانا سے جو سوال کیا گیا تھا، وہ محض اسی قدر تھا کہ ''کیا سریانی نام کی کسی زبان کا وجود ہے؟'' اور اس سوال کے جواب میں مولانا مدنی نے علامہ قسطلانی کی عبارت سے استدلال کر کے بتایا کہ ہاں سریانی زبان کا وجود ہے۔ اس حد تک آپ کو بھی اختلاف نہیں ہے۔ مولانا کے پیش نظر یہ تحقیق ذکر کرنا تھا ہی نہیں کہ انجیل کی زبان کیا تھی؟ پھر انہیں متعلقہ کتب یا اہل علم سے رجوع کا مشورہ چہ معنی دارد۔ اس نوعیت کے سوال جواب سے ایک نئی بحث کا آغاز کر لینا جو سائل کا مطلوب و مقصود بھی نہیں، اشراق کے تحقیق کار کا عجب طرز عمل ہے!

اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ غوری صاحب نے اس مسئلہ پر دلائل دینے کی بجائے بات کو مزید آگے پھیلاتے ہوئے سارا زور تحقیق اس بات پر صرف کر دیا کہ عیسیٰ کے جوارشادات بائبل کے عہد نامہ جدید کی چاروں انجیلوں اور دیگر تحریروں میں درج ہیں، وہ کبھی بھی اپنی اصلی حالت میں نہیں لکھے گئے تھے...ان کی ابتدا ہی یونانی ترجمہ سے ہوئی...وغیرہ وغیرہ ـــــ حالانکہ نہ علامہ قسطلانی نے اس بحث کو چھیڑا ہے اور نہ مولانا مدنی نے اس طرف کوئی اشارہ کیا ہے اور پھر یہاں بھی وہی بے لچک اور غیر معروضی انداز تحقیق جیسے یہ ایک 'مسلّمہ حقیقت' ہے اور اس میں کسی دوسری رائے کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

اب ہم اس بات کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں کہ ان کا یہ دعویٰ کس حد درست ہے کہ اناجیل ابتدا ہی سے یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں؟

حقیقت یہ ہے کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا ان کے حواری اور ابتدائی تبعین یونانی زبان جانتے تھے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے Jewish Ency ۹/ ۲۴۷ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے کہ Papias جو دوسری صدی میلادی کے اوائل کا ماخذ ہے، بتاتا ہے کہ متی نے مسیح کے ملفوظات کا مجموعہ کسی تاریخی ترتیب کے بغیر عبرانی (یا آرامی) زبان میں تیار کیا تھا اور مرقس نے متفرق طور پر پطرس حواری سے جو کچھ سنا تھا، اسے مرتب کیا۔ اور ظاہر ہے کہ پطرس کی زبان بھی یونانی نہیں تھی، بلکہ عبرانی اور آرامی آمیز سریانی ہی تھی تو واضح ہوا کہ متی اور مرقس کے صحیفے یونانی زبان میں نہیں لکھے گئے۔ نیز اردو دائرہ معارف اسلامی کے مقالہ نگار نے The Birth of Chri, Alfred Loisey Religion ص ۳۶۶ تعلیقہ ۶۰ کے حوالہ سے لکھا کہ یوحنا کی انجیل آرامی میں تحریر تھی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ۳/ ۵۲۴ کے مقالہ نگار کے مطابق اناجیل کے مآخذ کی بحث میں جو اکثر Q کا ذکر آتا ہے، اس کے بارے میں F.C.Burkitt نے بڑی دانش مندی سے اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ Q کا اصل نسخہ آرامی زبان میں تھا۔ نیز اس نے یہ لکھا ہے کہ 'محرف مسیحی ادب' میں ایک انجیل یہود دیہ ہے، یہ مغربی آرامی زبان میں تھی اور یہ انجیل مسیحیوں کے ابتدائی فرقوں میں سے ناصریوں اور ابیاتیوں میں دوسری صدی کے نصف ۱۵۰ء تک رائج رہی، بعد میں ان فرقوں کی تباہی کے ساتھ یہ انجیل بھی گم ہوگئی۔ اور یونانی تراجم کی ابتدا یقیناً اس کے بعد ہوئی۔ (تفصیل: Procryphal Literature زیر مادہ Echp-brit)

'اشراق' کے مضمون نگار کی تردید اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ آج سے تقریباً تین سو سال قبل انجیل برناباس

www.javedahmadghamidi.com

کا جونسخہ دریافت ہوا، وہ اطالوی زبان میں تھا اور اس کے اوپر لکھا ہوا تھا کہ یہ برنا باس حواری کی لکھی ہوئی انجیل ہے۔ مولانا تقی عثمانی صاحب نے اپنی کتاب 'عیسائیت کیا ہے؟' (ص ۱۷۱ تا ۱۹۲) میں تفصیل سے اس انجیل کا تعارف پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس انجیل کا درجہ اسناد بائبل کے کسی بھی صحیفے سے کم نہیں ہے۔ یہ انجیل حضرت عیسیٰؑ کے بعد ابتدائی دور کی ہے اور یونانی تراجم کی ابتدا یقیناً اس کے بعد ہوئی ہے۔

اگرچہ بعض لوگوں نے یہ ذکر کیا ہے کہ عہد نامہ جدید کے جو قدیم ترین اجزا اب تک دستیاب ہوئے ہیں، وہ یونانی زبان میں ہیں۔ اگر اس دعویٰ کو درست تسلیم کر لیا جائے تو بھی اس سے یہ مطلب کشید کر لینا کہ ''حضرت عیسیٰؑ کے جو ارشادات انجیلوں اور دیگر تحریروں میں درج ہیں... (ان کے لکھے جانے کی) ابتدا ہی یونانی ترجمہ سے ہوئی۔'' قطعاً درست نہیں ہے، بلکہ مذکورہ دلائل کی روشنی میں اس بات کا واضح امکان موجود ہے کہ اصل اناجیل ضائع ہو گئیں اور موجودہ یونانی نسخے ان کا ترجمہ یا ترجمہ در ترجمہ ہیں، نیز برنا باس حواری کی انجیل کی دستیابی ہی اشراق کے مضمون نگار کے دعویٰ کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے!!

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عبدالستار غوری

انجیل کی زبان؛ یونانی یا سریانی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

موقر جریدے ''الاعتصام'' کی اشاعت ۵۷/۳۴ (برائے ۲ تا ۸ ستمبر ۲۰۰۵) میں کسی صاحب نے سوال کیا تھا کہ 'کیا ''سریانی'' نام کی کوئی زبان ہے؟' اس کا جواب قابل احترام بزرگ عالم دین مولانا ثناء اللہ خان مدنی نے دیا تھا۔ جواب کا پہلا فقرہ تھا: 'سریانی' مستقل زبان کا نام ہے۔ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے، یہ جواب بالکل درست بھی ہے اور کافی بھی، لیکن مولانا نے اتنی بات پر اکتفا نہیں کیا۔ مولانا مدنی لکھتے ہیں:

''ارشاد الساری شرح بخاری (۶۵/۱) میں ہے: 'وقیل أن التوراۃ عبرانیة و الانجیل سریانی'۔ ''کہا جاتا ہے کہ تورات عبرانی اور انجیل سریانی زبان میں تھی۔''

مولانا مزید لکھتے ہیں:

''حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے: (أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم أمره أن یتعلم السریانیة) کہ 'نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا تھا'۔ (فتح الباری ۱۸۶/۱۳) امام ترمذی نے اس حدیث پر یوں باب قائم کیا ہے: باب ما جاء فی تعلیم السریانیة۔

عربانی [غالباً یہاں 'عربی' ہونا چاہیے تھا] زبان کی اصل سریانی ہے، جس طرح کہ فاکہی نے اخبار مکہ میں اپنی سند کے ساتھ ابن عباس سے اس امر کی تصریح کی ہے۔''

مولانا نے ارشاد الساری شرح بخاری کے حوالے سے جو بات کہی تھی وہ حوالے کی حد تک تو صحیح تھی، لیکن واقعہ کے اعتبار سے صحیح نہیں تھی۔ مولانا سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ لکھ دیجیے۔ اس کے جواب میں ایک مختصر سا مضمون 'سریانی اور ارامی زبان کے بارے میں وضاحت' قلم برداشتہ لکھ دیا

گیا۔ یہ مضمون ''الاعتصام'' کو بھی بھجوایا گیا اور ''محدث'' کو بھی۔لیکن کسی نے بھی اس کی اشاعت مناسب نہ سمجھی۔ چنانچہ اسے ماہنامہ ''اشراق'' میں اشاعت کے لیے دے دیا گیا۔ جہاں یہ دسمبر ۲۰۰۵ کی اشاعت میں صفحہ ۳۳ تا ۳۶ پر شائع ہوا۔اس کے جواب میں ماہنامہ ''محدث'' کی اشاعت مارچ ۲۰۰۶ میں صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۹ پر جناب محمد اسلم صدیق صاحب کا ایک مضمون 'انجیل کی زبان؛ ایک ناقدانہ جائزہ' شائع ہوا۔ زیر نظر مضمون اسی کے جواب پر مشتمل ہے۔

جناب محمد اسلم صدیق لکھتے ہیں:

''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۵۰ء، ۵۲۲/۳) میں ہے کہ: ''مسیح اور آپ کے حواری نسلاً اور مذہباً اسرائیلی تھے اور ان کی مادری اور مذہبی زبان عبرانی تھی یا مغربی آرامی۔'' [یہ بات ایک حد تک درست ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ اور آپ کے حواریوں کی مذہبی زبان عبرانی اور مادری زبان ارامی تھی۔لیکن آگے جا کر جناب اسلم صدیق صاحب نے جو نتیجہ نکالا ہے کہ انجیل کی ممکنہ اصل پانچ زبانوں میں سے ایک عبرانی تھی، اس کی کیا بنیاد ہے۔ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ ؑ اور آپ کے حواریوں کی مادری زبان ارامی تھی اور مذہبی زبان عبرانی۔اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ انجیل کی زبان عبرانی تھی۔] (Jesus صفحہ ۴۸) ـــــ امریکہ کے یونین کالج میں عبرانی کے پروفیسر Moss Buttenwieser کے بقول حضرت عیسیٰ کے دور میں آرامی زبان بولی جاتی تھی [یہاں بھی وہی بات کہی گئی ہے جو میں نے کہی ہے۔اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ انجیل ارامی زبان میں لکھی گئی تھی۔حضرت عیسیٰ ؑ کے دور میں ارامی زبان بولی جانا اور بات ہے اور انجیل کا اس زبان میں لکھا جانا ایک دوسری بات ہے۔] ـــ مغربی مفکر Renen کے نزدیک حضرت عیسیٰ کی مادری، مذہبی اور وطنی زبان عبرانی آمیز سریانی تھی۔

نیز اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (پنجاب یونیورسٹی) کے مقالہ نگار نے مادّہ انجیل کے تحت لکھا ہے [زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے] کہ انجیل کی زبان آرامی یا ارامی کی کوئی شاخ تھی۔علامہ بدرالدین عینی نے صحیح بخاری کی حدیث کے الفاظ (كان ورقة بن نوفل يكتب الكتاب فيكتب من الانجيل بالعبرانية) کے تحت لکھا ہے کہ: قال التيمي: الكلام العبراني هو الذی انزل به جميع الكتب كالتوراة والانجيل ونحو هما وقال الكرماني: فهم منه أنّ الانجيل عبراني، قلت ليس كذلك، بل التوراة عبرانية والانجيل سرياني (عمدۃ القاری ۵۲/۱)۔''امام تیمیؒ کہتے ہیں کہ عبرانی وہ کلام (زبان) ہے جس میں تورات انجیل وغیرہ کتب کو نازل کیا گیا تھا۔امام کرمانی کہتے ہیں کہ اس سے سمجھ آتا ہے کہ انجیل عبرانی زبان میں تھی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بات درست نہیں بلکہ تورات عبرانی میں تھی اور انجیل سریانی زبان

میں تھی۔'' [امام کرمانی نے یہ تو ٹھیک کیا کہ امام تیمی کی اس غلطی کی نشان دہی کر دی کہ انجیل عبرانی زبان میں تھی، لیکن اس کی اصلاح کے طور پر جو یہ لکھا کہ 'یہ بات درست نہیں، بلکہ تورات عبرانی میں تھی اور انجیل سریانی زبان میں تھی۔' تو یہ بات خلاف واقعہ ہے کیونکہ انجیل سریانی زبان میں نہیں لکھی گئی تھی، بلکہ سریانی میں تو اس کا یونانی زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا۔] اور مولانا مودودیؒ نے اپنی کتاب 'نصرانیت قرآن کی روشنی میں' ص ۹۲ پر صاف لکھا ہے کہ ''حضرت عیسیٰ اور ان کے تمام حواریوں کی زبان سریانی تھی۔'' [اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ انجیل سریانی میں لکھی گئی تھی؟]

مذکورہ وضاحت کی روشنی میں انجیل کی اصل زبان کے متعلق پانچ آراء ہمارے سامنے آتی ہیں: عبرانی، سریانی، عبرانی آمیز سریانی، آرامی یا آرامی کی کوئی شاخ۔ ان مختلف آرا سے کم از کم یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ انجیل کی زبان کو آرامی قرار دینے کا جو بلند و بانگ [بلند بانگ] دعویٰ کیا گیا ہے، وہ کوئی مسلمہ حقیقت نہیں رکھتا۔ [میں نے اپنی تحریر میں کسی جگہ یہ ''بلند و بانگ دعویٰ'' نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس میں نے تو واضح طور پر لکھا ہے کہ انجیل کی زبان یونانی تھی، جبکہ حضرت عیسیٰ کی زبان ارامی تھی اور ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ پر کلام الٰہی ان کی اپنی زبان ہی میں نازل ہوا ہوگا، جیسا کہ آپ نے خود فرمان الٰہی نقل کیا ہے: ''وما ارسلنا من رسولٍ الا بلسان قومہٖ]''

جناب محمد اسلم صدیق صاحب نے اس عبارت میں بڑی حد تک اپنا استدلال پیش کر دیا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں کافی اضطراب پایا جاتا ہے، لیکن اس پر کلام اس وجہ سے مناسب نہیں لگتا کہ یہ طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لیے اس سے صرف نظر ہی بہتر ہے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے یہ سب کچھ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ ہی کے اعتماد پر قلم بند کیا ہے اور اصل انگریزی ماخذ خود دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ انگریزی الفاظ کے ہجے نقل کرنے میں کافی بے احتیاطی برتی گئی ہے۔ مثلاً Moses کو Moss لکھا گیا ہے۔ اس طرح کی اغلاط مضمون میں آگے بھی موجود ہیں مثلاً Semitic کو Semtic لکھا گیا ہے، ایرانی شہنشاہ Cyrus کو ہر جگہ Cyprus لکھا گیا ہے اور Aprocryphal کو Procryphal لکھا گیا ہے۔

جناب اسلم صدیق صاحب نے اپنے مضمون میں میری تحریر سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ ایک غیر متعلق بات معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اپنی تحریر میں کہیں یہ ''بلند و بانگ'' دعویٰ نہیں کیا کہ انجیل کی زبان آرامی تھی بلکہ میں نے تو لکھا تھا ''انجیل ابتدا ہی سے یونانی (Greek) زبان میں لکھی گئی تھی، جب کہ حضرت مسیح کی زبان آرامی (Aramaic) تھی اور انھوں نے اپنے مواعظ و بشارات اسی آرامی زبان میں ارشاد فرمائے تھے۔'' (اشراق ۳۳)۔ عجیب بات ہے کہ فاضل تنقید نگار اتنی سادہ سی بات کیوں نہ سمجھ سکے۔ میں نے تو انجیل کی زبان کو کہیں بھی ارامی قرار نہیں دیا، بلکہ یہ

www.javedahmadghamidi.net.com

کہا ہے کہ انجیل کی زبان یونانی تھی۔ البتہ میں نے اس بات کی تردید کی تھی کہ انجیل کی اصل زبان سریانی تھی۔ میں نے تو یہ بھی لکھا تھا کہ ''لیکن ان (حضرت مسیح) کے جوارشادات بائبل کے عہد نامۂ جدید کی چاروں انجیلوں اور دیگر تحریروں میں درج ہیں، وہ کبھی بھی اپنی اصلی حالت میں (یعنی ارامی زبان میں) نہیں لکھے گئے تھے۔... اور وہ شروع ہی سے یونانی زبان میں لکھے گئے تھے۔'' (اشراق ۳۳۔۳۴)۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جناب اسلم صدیق صاحب نے یہ دعویٰ کیوں اور کیسے کیا کہ ''انجیل کی زبان کو ارامی قرار دینے کا جو 'بلند و بانگ' دعویٰ کیا گیا ہے وہ کوئی مسلمہ حقیقت نہیں رکھتا۔'' میں نے تو مضمون میں کہیں بھی 'انجیل کی زبان کو آرامی' قرار نہیں دیا۔ ہاں، میں نے حضرت عیسیٰ کی زبان ضرور آرامی بتائی ہے۔ مضمون کے آخر میں ایک نوٹ لکھا گیا ہے: ''اس تحریر کو جان بوجھ کر حوالوں سے گراں بار نہیں کیا گیا۔'' لیکن جناب اسلم صدیق صاحب کے 'ایک ناقدانہ جائزے' کو دیکھ کر اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اصل حقیقت ظاہر کرنے کے لیے کچھ مستند حوالہ جات پیش کر ہی دیے جائیں۔ چنانچہ ذیل میں پہلے کچھ حوالے پیش کیے جا رہے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انجیل ابتدا ہی سے یونانی (Greek) زبان میں لکھی گئی تھی، جبکہ حضرت مسیح کی [اپنی بول چال کی] زبان آرامی (Aramaic) تھی۔ یہ حوالے بائبل کی مختلف نقطۂ نظر پر مشتمل اور مختلف ادوار میں لکھی گئی تفسیروں، بائبل کے تعارف و تواریخ پر مبنی کتب اور عالمی سطح پر مسلمہ انسائیکلو پیڈیاز سے ماخوذ ہیں:

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دی لرننگ بائبل میں تحریر ہے:

''The New Testament books were written in Greek, an International language during this period of the Roman Empire.''(The Learning Bible, Ed. Howard Clerk Kee, etc., CEV, NY., American Bible Society, 2000, p.13).

''عہد نامۂ جدید کی کتابیں یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، جو اس دور کے رومن امپائر میں ایک بین الاقوامی زبان تھی۔''

اسی کتاب میں مزید بیان کیا گیا ہے:

''Though Jesus and his disciples spoke Aramaic, the books of the New Testament were first written in the "everyday" Greek of that time. The New Testament writers also were familiar with the Greek translation of the Jewish scriptures (called the Septuagint). A number of quotations

found in the New Testament come directly from the Greek translation, while others were translated into Greek from the Hebrew of the Jewish Scriptures. ... The earliest copy of the entire Greek New Testament dates from the fourth century, and the earliest fragment of a New Testament book dates from around A. D. 125. Also of value to Biblical scholars are early translations of New Testament writings into Coptic, Syriac, and Latin.’’ (The Learning Bible, op.cit., p. 1732)

’’اگر چہ حضرت عیسیٰ اوران کے حواری ارامی زبان بولتے تھے،لیکن عہد نامۂ جدید کی کتابیں شروع ہی سے اس دور کی روزمرہ کی یونانی میں لکھی گئی تھیں۔عہد نامۂ جدید کے مصنفین یہودی صحیفوں کے یونانی ترجمے (جسے ہفتادی ترجمہ کہا جاتا تھا) سے بھی آشنا تھے۔عہد نامۂ جدید میں پائے جانے والے متعدد اقتباسات اس یونانی ترجمے سے براہ راست نقل کیے گئے ہیں جبکہ بعض دوسرے اقتباسات یہودی صحیفوں کو عبرانی سے یونانی میں ترجمہ کر کے درج کیے گئے تھے۔... مکمل یونانی عہد نامہ جدید کی قدیم ترین کاپی چوتھی صدی سے تعلق رکھتی ہے اور عہد نامۂ جدید کی ایک کتاب کا قدیم ترین ٹکڑا ۱۲۵ عیسوی کے لگ بھگ کا ہے۔عہد نامۂ جدید کی تحریروں کے قبطی، سریانی اور لاطینی میں ابتدائی تراجم بھی بائبل کے علما کے لیے بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔‘‘

ریڈرز بائبل میں بیان کیا گیا ہے کہ عہد نامۂ جدید ابتدا ہی سے عام روزمرہ کی یونانی زبان کوائنی میں لکھا گیا تھا:

‘‘All the books of the New Testament were originally written in koine, the everyday Greek of the time, which was spoken by most peoples of the Roman Empire. The various books show different levels of competence in koine, the most highly literary being the Letter to the Hebrews and I Peter. Least polished are the Gospel of Mark and Revelation. As scholars have shown, certain turns of expression in the Greek of the Gospels reflect traces of an underlying Aramaic idiom, which was the mother tongue of Jesus and his disciples.’’ (The Reader's Bible, Ed. Bruce M. Metzger, London, The Reader's Digest Association, 1995, p.17)

’’عہد نامۂ جدید کی تمام کتابیں اصلاً کوائنی میں لکھی گئی تھیں جو اس زمانے کی روزمرہ محاورے کی یونانی زبان تھی اور جسے رومن امپائر کے اکثر لوگ بولتے تھے۔مختلف کتابوں سے کوائنی کی مہارت کی مختلف سطحیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان میں ادبی لحاظ سے سب سے زیادہ بلند مقام ’’عبرانیون‘‘ اور ’’ا۔پطرس‘‘ کو حاصل ہے۔سب سے کم تر درجہ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انجیل مرقس اور مکاشفے کا ہے۔جیسا کہ علما نے واضح کیا ہے انجیلوں کی یونانی زبان میں اظہار کی بعض صورتوں سے ان کی بنیاد میں جاری وساری آرامی محاورے کے نشانات کی عکاسی ہوتی ہے، جو حضرت عیسیٰ اوران کے حواریوں کی مادری زبان تھی۔''

نیوآکسفرڈ اینوٹیٹڈ بائبل میں لکھا گیا ہے کہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کی وفات کے چالیس سے ساٹھ سال بعد لکھی گئی تھیں۔اوراگرچہ حضرت عیسیٰ اوران کے حواری آرامی زبان بولتے تھے،لیکن انجیلیں روزمرہ کی یونانی زبان کوائنی میں لکھی گئی تھیں:

''Scholars generally agree that the Gospels were written forty to sixty years after the death of Jesus. They thus do not present an eyewitness or contemporary account of Jesus' life and teaching. Even the language has changed. Though Greek had become the common language used between groups whose primary languages were different in the eastern Roman Empire and inscriptions and fragments of Greek translations of the Hebrew Bible show that Greek was used even among Jews within Judea, Jesus, his disciples, and crowds would have spoken Aramaic. Despite scholarly efforts to detect an underlying Aramaic original for Mark or Matthew, it is probable that all the evangelists wrote in the common ("koine") Greek of their day.'' (The New Oxford Annotated Bible III Edition, Ed. Michael D. Coogan, Oxford University Press, 2001, p. 4 [NT])

''علما بالعموم اس بات پر متفق ہیں کہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کی وفات کے چالیس سے ساٹھ سال بعد کے دوران میں لکھی گئی تھیں۔اس طرح وہ حضرت عیسیٰ کی زندگی اور تعلیم کی کوئی معاصرانہ تفصیل یا عینی شہادت پیش نہیں کرتیں۔حتیٰ کہ زبان بھی بدلی ہوئی ہے۔مشرقی رومن امپائر میں یونانی ایک عمومی زبان بن چکی تھی اوراسے وہ لوگ آپس میں استعمال کرتے تھے،جن کی ابتدائی زبانیں مختلف تھیں۔کتبوں اورعبرانی بائبل کے یونانی تراجم کے ٹکڑوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونانی زبان یہودیہ کے اندر یہودیوں میں بھی مستعمل تھی اور حضرت عیسیٰ،ان کے حواری اور عوام الناس ارامی زبان بولتے ہوں گے۔مرقس اورمتی کی انجیلوں کی بنیاد میں موجود اصل ارامی زبان دریافت کرنے کی عالمانہ کوششوں کے باوجود امکان یہ ہے کہ تمام انجیل نگار اپنے دور کی عام بول چال کی یونانی زبان (کوائنی) میں لکھا کرتے تھے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

دی وکلف بائبل کمنٹری نے لکھا ہے کہ اگرچہ پاپیاس متی کی انجیل کے متعلق یہ کہتا ہے کہ اس کی یادداشتیں ابتداءً آرامی زبان میں لکھی گئی تھیں، (اور جب اسے صحیح شکل میں مدون کیا گیا، اس وقت اسے یونانی میں منتقل کر دیا گیا)، لیکن موجودہ انجیل کے یونانی متن میں اس طرح کے کسی ترجمے کے کوئی نشانات موجود نہیں ہیں:

“..., and also to the statement of Papias that "Matthew wrote the words in the Hebrew dialect, and each one interpreted as he could" (Eusebius Ecclesiastical History 3.39). Many have explained Papias' statement as referring to an Aramaic original from which our Greek Gospel is a translation. Yet our Greek text does not bear the marks of a translation, and the absence of any trace of an Aramaic original casts grave doubts upon this hypothesis. Goodspeed argues at length that it would be contrary to Greek practice to name a Greek translation after the author of an Aramaic original, for Greeks were concerned only with the one who put a work into Greek. As examples he cites the Gospel of Mark (It was not called the Gospel of Peter) and the Greek Old Testament which was called the Septuagint (Seventy) after its translators, not after its Hebrew authors (E. J. Goodspeed, Matthew, Apostle and Evangelist, pp. 105, 106). Thus Papias is understood to mean that Matthew recorded (by shorthand?) the discourses of Jesus in Aramaic, and later drew upon these when he composed his Greek Gospel.” (The Wycliffe Bible Commentary, Ed. Everett F. Harrison, Chicago, Moody Press, 1983, p. 929)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

”...، پاپیاس کے اس بیان کے متعلق بھی کہ ”متی نے الفاظ عبرانی بولی میں لکھے تھے اور ہر ایک نے ان کا ایسا ترجمہ کیا، جیسا وہ کر سکتا تھا۔“ اکثر لوگوں نے پاپیاس کے بیان کی تشریح اس طرح کی ہے کہ اس میں ایک ایسی ارامی اصل کا حوالہ دیا گیا ہے جس سے ہماری یونانی انجیل ترجمہ کی گئی ہے۔ لیکن ہمارے یونانی متن پر کسی ترجمے کے کوئی نشانات موجود نہیں۔ اور کسی ارامی اصل کے نشانات کی عدم موجودگی سے یہ مفروضہ سخت مشکوک بن جاتا ہے۔ گڈ سپیڈ نے اس بات کے تفصیلی دلائل دیے ہیں کہ یہ بات یونانی روایت کے سراسر خلاف ہے کہ کسی یونانی ترجمے کا نام کسی ارامی اصل کے مصنف کے نام پر رکھا جائے، کیونکہ اہل یونان صرف اس سے غرض رکھتے تھے جس نے

کسی کتاب کو یونانی زبان میں پیش کیا ہو۔ اس کے لیے وہ مرقس کی انجیل کی مثال پیش کرتا ہے (اسے پطرس کی انجیل نہیں کہا جاتا تھا) اور یونانی عہد نامہ قدیم کی مثال بھی پیش کرتا ہے، جسے اس کے مترجمین (کی تعداد) کی مناسبت سے 'ہفتادی' کہا جاتا تھا، نہ کہ اس کے عبرانی مصنفین کے نام پر۔ اس طرح سمجھ میں یہ آتا ہے کہ پاپیاس کا مطلب یہ تھا کہ متی نے (مختصر نویسی کے طریق پر) حضرت عیسیٰ کی باتیں ارامی زبان میں جمع کی تھیں اور بعد میں جب اس نے اپنی یونانی انجیل مدون کی، تو اس نے اپنی ان یادداشتوں سے استفادہ کیا۔''

پیکس کی تفسیر بائبل میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کتابیں غالباً یقینی طور پر یونانی میں لکھی گئی تھیں، اگرچہ ان کے تمام مصنفین ارامی زبان بھی بولتے ہوں گے:

''The Language in which these records were originaly written is almost certainly Greek, though quite definitely their authors would almost all have spoken in Aramaic as well. In some cases it is possible that first drafts of their work were in Aramaic. .... After that, though the Romans conquered Greece, the Greek language conquered the Romans and followed them westwards. In the process, quite naturally, the old Attic was modified by the nations through which it spread, until it became a great universal language to which we have given the name of Koine, the cosmopolitan dialect in which many Greek dialects had some share but wherein Attic was the foundation of them all. Now scholars are in the main agreed that this language, especially in its more colloquial form, is that of the NT authors. ... New papyrus discoveries in Egypt seemed to reveal a type of Greek which was almost exactly that of the NT. .... In the Egyptian city during these centuries lived thousands of Jews who had left their own land and settled here, as well as in many other centres, for various reasons. Gradually they lost all knowledge of their Aramaic mother- tongue and could understand only Greek. For this reason, it seems that in middle of the third century B.C. the OT scriputres had to be translated from Hebrew into Greek. ... Granted that the Greek of the NT was the living language of the day, as it was both written and spoken, it should also be insisted that it was a language impregnated by the Bible,

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

its Semitic idioms and thought-forms.'' (Peake's Commentary on the Bible, Ed. Matthew Black, London, Thomas Nelson and Sons Ltd., 1962, p. 659f)

''وہ زبان جس میں ابتدائی طور پر عام ریکارڈ لکھا گیا تھا غالباً یقینی طور پر یونانی ہے، تاہم یہ بات بھی بالکل یقینی ہے کہ اس ریکارڈ کے قریباً تمام مصنفین ارامی زبان میں بھی بات چیت کرتے تھے۔[اس کی مثال ہمارے ہاں پشاور میں دیکھی جا سکتی ہے: وہاں کے قریباً تمام شہری صدیوں سے دو مختلف زبانیں ہندکو اور پشتو روانی سے بولتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ اکثر تو اس پر مستزاد اردو اور پنجابی بھی بڑی آسانی سے بول لیتے ہیں اور انگریزی و فارسی بھی۔ جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ بچہ ابتدائی چھ سالوں میں یکساں روانی اور مہارت کے ساتھ چھ زبانیں سیکھنے اور ادا کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکتا ہے]۔ بعض صورتوں میں اس بات کا امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی تحریروں کا ابتدائی مسودہ ارامی زبان میں ہو... اس کے بعد اگرچہ رومیوں نے یونان کو فتح کر لیا، لیکن یونانی زبان نے رومیوں کو فتح کر لیا اور مغرب کی جانب ان کے تعاقب (اور ہمراہی) میں آگے بڑھتی رہی۔ بالکل فطری طور پر اس عمل کے دوران میں ایتھنز کی قدیم زبان کی ہیئت ان قوموں کے زیر اثر تبدیل ہوتی گئی جن میں یہ پھیلتی جا رہی تھی، یہاں تک کہ یہ عظیم عالمی زبان کی حیثیت اختیار کر گئی، جس کو ہم کوائنی کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایک عالمی بولی تھی جس میں یونانی زبان کی بہت سی بولیوں کا کچھ نہ کچھ حصہ تھا، لیکن ایتھنز کی بولی ان سب کی بنیاد میں شامل تھی۔ علما اس بات پر بڑی حد تک متفق ہیں کہ یہ زبان، بالخصوص اپنی روزمرہ شکل میں، عہد نامۂ جدید کے مصنفین کی زبان تھی۔... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں کاغذ (Papyrus) کی نئی دریافتیں یونانی زبان کی ایک ایسی صنف کی نشان دہی کر رہی ہیں جو تقریباً بعینہٖ عہد نامہ جدید کی زبان تھی۔

ان صدیوں کے دوران میں اس مصری شہر میں ہزاروں یہودی رہایش پذیر تھے، جو متعدد اسباب کی بنا پر اپنی اصل سرزمین (فلسطین) چھوڑ کر یہاں اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سے دوسرے مراکز میں آباد ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی مادری زبان ارامی کا تمام علم فراموش کر دیا اور اب وہ صرف یونانی زبان ہی سمجھ سکتے تھے۔ اس وجہ سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ تیسری صدی قبل مسیح کے وسط میں عہد نامۂ قدیم کے صحیفوں کا عبرانی سے یونانی زبان میں ترجمہ کرنا پڑا... مانا کہ عہد نامۂ جدید کی یونانی زبان اس دور کی زندہ زبان تھی، کیونکہ یہ لکھی بھی جاتی تھی اور بولی بھی، لیکن اس بات پر بھی زور دینا ضروری ہے کہ یہ ایک ایسی زبان تھی جس میں بائبل، اس کے سامی زبانوں کے محاورے اور فکری ہیئتیں رچی بسی ہوئی تھیں۔''

ڈملو کی تفسیر بائبل میں ہے:

"The New Testament was written in Greek." (A Commentary on the Holy Bible, Ed. The Rev. J. R. Dummelow, London, MacMillan and Co. Ltd., St. Martin's Street, 1956, p.xv)

''عہد نامہ جدید یونانی زبان میں لکھا گیا تھا۔''

فنک اینڈ ویگنلس انسائیکلو پیڈیا میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ بعض لوگوں کا دعویٰ ہے کہ ان میں سے کچھ دستاویزات کی پشت پر آرامی تحریریں تھیں، لیکن یہ تمام دستاویزات یونانی زبان ہی میں اشاعت پذیر ہوئی ہیں اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ لکھی بھی یونانی ہی میں گئی تھیں:

"Although some have argued that Aramaic originals lie behind some of these documents (especially the Gospel of Matthew and the Epistle of the Hebrews), all have been handed down in Greek, very likely the language in which they were composed.

For a time, some Christian scholars treated the Greek of the New Testament as a special kind of religious language, providentially given as a proper vehicle for the Christian faith. It is now clear from extrabiblical writings of the period that the language of the New Testament is Koine, or common Greek, that which was used in homes and marketsplaces." (Funk & Wagnalls New Encyclopedia, Ed. Norma H. Dickey, USA, Funk & Wagnalls Inc., 1986, Vol. 3, p.47)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''اگرچہ بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ ان میں سے کچھ دستاویزات (بالخصوص متی کی انجیل اور عبرانیوں کے نام خط) کے پیچھے اصل ارامی تحریریں کارفرما تھیں، تاہم (یہ بات بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ) سب کچھ یونانی زبان ہی میں آگے منتقل کیا گیا ہے۔ اور اس بات کا بڑا امکان ہے کہ یہ اسی زبان (یونانی) میں مدون ہوئی تھیں۔

کچھ عرصے تک بعض مسیحی علما عہد نامۂ جدید کی یونانی زبان کو ایک خاص قسم کی مذہبی زبان سمجھتے تھے۔ جو مسیحی دین کی خوش قسمتی کے طور پر ایک موزوں وسیلۂ اظہار کی صورت میں مہیا کی گئی تھی۔ اب اس دور کی بائبل کے علاوہ دیگر تحریروں سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد نامہ جدید کی زبان کوائنی یا عوامی یونانی زبان تھی جو گھروں اور کاروباری مراکز میں استعمال ہوتی تھی۔''

انسائیکلو پیڈیا امریکانا کے مقالہ نگار نے اس موضوع پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ کے افعال واقوال کے متعلق زبانی روایات بلاشبہ ارامی زبان ہی میں رائج تھیں، تاہم عہد نامۂ جدید شروع سے

آخر تک یونانی زبان میں لکھی جانے والی کتاب ہے:

"The New Testament is, from beginning to end, a Greek book. Although the earliest oral tradition of Jesus' deeds and sayings undoubtedly circulated in Aramaic, which was still the spoken language of Palestine and of some other parts of the Near East (certainly among Jews), it was not long bofore, this oral tradition was translated into ordinary, everyday Greek which was spoken everywhere else in the civilized Mediterranean world. (Traces of the original Aramaic tradition survive here and there: for expample, in Mark 5:41, 15:34).

This ordinary or "common" (Koine) Greek was spoken and written by people everywhere, from the borders of Nubia to the market towns in Gaul and the army camps beyond the Danyube, from the strait of Gibraltar to the borders of India. It was basically the Attic dialect of classical and 4th century Greek, ... for it was this language which had been carried across the Middle East by Alexander the Great (r. 336-323) and soon became the lingua franca of the whole Eastern Mediterranean and Near Eastern world ruled by his successors, chiefly the Ptolemies in Egypt and the Seleucids in Syria, Asia Minor, and the Whole vast territory eastward to the Indus. In the West, Greek long ago had been introduced by colonists in Lower Italy, Sicily, Gaul, and Spain, and by traders here and there as far as the Atlantic Ocean."(The Encyclopedia Americana, Ed. Lavinia P. Dudley etc., NY, Americana Corporation, 1954, Vol. 3, p.654)

"عہد نامۂ جدید شروع سے اخیر تک ایک یونانی کتاب ہے۔ اگرچہ حضرت عیسیٰ کے اعمال واقوال کی اولین زبانی روایت بلاشبہ ارامی زبان میں رائج رہی، جو اس وقت تک فلسطین اور مشرق قریب کے بعض دوسرے حصوں میں بولی جانے والی زبان تھی (یہودیوں میں یقینی طور پر) تاہم زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس زبانی روایت کا عام روزمرہ کی یونانی زبان میں جو مہذب بحیرۂ روم کے ممالک میں ہر جگہ بولی جاتی تھی، ترجمہ ہو گیا۔ (اصل ارامی روایت کے نشانات کہیں کہیں اب بھی باقی ہیں مثلاً مرقس ۵:۴۱، ۱۵:۳۴)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہ سادہ اور عوامی (کوائنی) یونانی زبان ہر جگہ لوگوں میں بولی اور لکھی جاتی تھی: نوبیا کی سرحدوں سے گال (مغربی یورپ مشتمل بر شمالی اٹلی، فرانس، بیلجئم، ہالینڈ، جرمنی، سوئٹزر لینڈ) کے کاروباری شہروں اور ڈینیوب کے پار فوجی کیمپوں تک، آبنائے جبرالٹر سے ہندوستان کی سرحدوں تک۔ بنیادی طور پر یہ چوتھی صدی کی کلاسیکی یونانی زبان کی ایتھنز کی بولی (Attic) تھی۔... کیونکہ یہی زبان تھی جو سکندر اعظم (دور حکمرانی ۳۳۶ تا ۳۲۳ ق م) مشرق وسطیٰ کے پار لے گیا تھا اور جو جلد ہی پورے مشرقی بحیرۂ روم اور مشرق قریب کی دنیا کی گھریلو اور تجارتی زبان بن گئی، جہاں اس کے جانشینوں کی حکومت تھی: خاص طور پر مصر میں پٹولمیوں کی اور شام، ایشیائے کوچک، اور مشرق میں دریائے سندھ تک پھیلے ہوئے وسیع خطے پر سلوسیوں (Seleucids) کی۔ مغرب میں بہت پہلے یونانی زبان استعماری آبادکاروں نے زیریں اٹلی، سسلی، گال، اور سپین میں متعارف کرا دی تھی اور تاجروں نے اسے بحر اوقیانوس جیسے دور دراز مقام تک جگہ جگہ پہنچا دیا تھا۔‘‘

کولیئرز انسائیکلو پیڈیا لکھتا ہے کہ عہد نامہ جدید کی کتابوں کی زبان روزمرہ بول چال کی سادہ اور عوامی زبان تھی، نہ کہ مسجع و مقفّٰی صاف اور شستہ یونانی زبان:

‘‘Often a reading in clear or polished Greek is discarded, for the authors of the New Testament Books wrote in the Popular, everyday language that had little of the elegance of the classic, literary Greek.’’ (Collier's Encyclopedia, Ed. William D. Halsey, NY, MacMillan Educational Corporation, 1976, Vol. 4, p. 134)

’’اکثر اوقات ایسی قراء ت جو واضح، صاف ستھری، شستہ اور آراستہ و پیراستہ ہو، رد کر دی جاتی ہے، کیونکہ عہد نامۂ جدید کی کتابوں کے مصنفین نے مقبول عام روزمرہ کی زبان میں لکھا تھا جس میں کلاسیکی، ادبی یونانی زبان کی شان و شوکت اور حسن و آرایش کا بہت کم شائبہ تھا۔‘‘

دی ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا لکھتا ہے کہ عہد نامہ جدید یونانی زبان میں لکھا گیا تھا، تاہم حضرت عیسیٰ اور ان کے حواری آرامی زبان بولتے تھے:

‘‘The New Testament was written in Greek, which was widely spoken during the time of Jesus. However, Jesus and his disciples spoke Aramaic.’’ (The World Book Encyclopedia, Chicago, Field Enterprises Educational Corporation, 1977, Vol. 2, p.222)

’’عہد نامہ جدید اس یونانی زبان میں لکھا گیا تھا جو حضرت عیسیٰ کے زمانے میں وسیع علاقے میں بولی جاتی تھی،

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تاہم حضرت عیسیٰ اوران کے حواری ارامی زبان بولتے تھے۔‘‘

دی نیوانسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (میکروپیڈیا) میں بیان ہے کہ مرقس کی انجیل ابتدا ہی سے یونانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ یہ آرامی سے یونانی میں ترجمہ کی گئی ہو، کیونکہ الفاظ کا دروبست اس کی تائید نہیں کرتا:

“'Q' was a source written in Greek as was Mark, which can be demonstrated by word agreement (not possible, for example, with a translation from Aramaic, although perhaps the Greek has vestiges of Semitic structure form). .... Mark is written in rather crude and plain Greek, with great realism. ... In Mark, some Aramaic is retained, transliterated into Greek, and then translated. ... In the two miracle stories, the Aramaic may have been retained to enhance the miracle by the technique of preserving Jesus' actual words. And a cry of Jesus on the Cross is given in Aramaized Hebrew.” (The New Enc. Britannica, Macropaedia, Chicago, Enc. Britannia, Inc., 1989, Vol. 14, p. 824,25)

’’ ’کیوْ‘ (Q) ایک ماخذ تھا جو مرقس کی انجیل کی طرح یونانی زبان میں لکھا گیا تھا، جس کی توضیح لفظی مناسبتوں کے ذریعے سے کی جاسکتی ہے (ارامی سے ترجمے میں یہ ممکن نہیں اگرچہ شاید اس یونانی زبان میں سامی زبانوں کی ساخت اور ہیئت کے اثرات وباقیات دیکھے جاسکتے ہیں)۔... مرقس کی انجیل زیادہ خام اور سپاٹ یونانی زبان میں لکھی گئی ہے جس میں حقیقت نگاری زیادہ نمایاں ہے۔... مرقس کی انجیل میں بعض ارامی الفاظ باقی رکھے گئے ہیں اوران کا یونانی زبان میں تلفظ دے دیا گیا ہے اور پھران کا ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے۔... دو معجزاتی کہانیوں میں ارامی اس غرض سے باقی رکھی گئی ہوگی تاکہ حضرت عیسیٰ کے اصل الفاظ محفوظ کرنے کے ذریعے سے معجزے کے اثرات میں اضافہ کیا جاسکے۔ اور (اسی طرح) صلیب پر حضرت عیسیٰ کی چیخ وپکار ارامی آمیز عبرانی میں درج کی گئی ہے۔‘‘

دی یونیورسل ورلڈ ریفرنس انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ قبل از انجیل کے ماخذ کی زبان آرامی تھی جو حضرت عیسیٰ بولا کرتے تھے، لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ ماخذ تحریری شکل میں موجود تھے یا صرف زبانی روایت تک محدود تھے:

“Among the earliest books of the New Testament were the Gospels. Even earlier, however, were their sources the written and oral traditions

www.javedahmadghamidi.com

that lay behind them. The striking similarities that exist between the discourse sections of Matthew, Mark, and Luke indicate that these Evangelists probably used a common source, which has since disappeared. Some have speculated that the language of this pre-Gospel source was Aramaic, the language of Christ, but there is disagreement as to whether the source was extant in writing or in oral tradition.'' (The Universal World Reference Encylopedia, Ed. V. S. Thatcher, Chicago, Consolidated Book Publishers, 1970, Vol.2, p.676)

''انجیلیں عہد نامۂ جدید کی اولین کتابوں میں شامل تھیں۔ تاہم ان سے بھی قدیم ان کے ماخذ تھے، یعنی ایسی تحریری اور زبانی روایات جو ان کی پشت پر موجود تھیں۔ نمایاں یکسانیتوں سے جو متی، مرقس اور لوقا کی گفتگو والی فصلوں میں موجود ہیں، یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان انجیل نگاروں نے غالباً کوئی مشترک ماخذ استعمال کیا ہے، جو اب غائب ہو چکا ہے۔ بعض لوگوں کا گمان یہ ہے کہ اس قبل از انجیل ماخذ کی زبان ارامی تھی جو حضرت عیسیٰ کی زبان تھی، لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا یہ ماخذ تحریری شکل میں موجود تھا یا زبانی روایت کی صورت میں۔

دی بائبل ان دی میکنگ میں بھی اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اس کے خیال میں عہد نامہ جدید کی کتابوں کو عملی ضرورت کے تحت یونانی ہی میں ترتیب دیا جانا مناسب تھا:

''Paul and the other early Chirstian letter-writers wrote in Greek. The reason was a practical one. Greek was in their day an international langugae, used by traders and others as a common means of communication. As English is widely used throughout the world today, and as French was used in diplomatic and other circles in Europe last century, so Greek was used internationally in Paul's day. It was the language of the Great cities of the world, the language of the people whom Paul and his associates specially wanted to reach. It had even penetrated Syria and Palestine. The language of the latter country was Aramaic, which Jesus spoke: ... Paul also spoke Aramaic. Nevertheless, Even at Jerusalem Greek had come to be used to a considerable extent, and Paul had no difficulty in writing or speaking it. ... Paul and many others like him, though they cherished their own language and culture,

communicated with ease in Greek and Probably thought in it too. So it was as natural that all the literature of the early Christians should have been written in this language, for there would have been no reason for them to write in any other [language] unless they had wished to restrict the audience to a limited group, which they certainly did not.” (Geddes MacGregor, The Bible in the Making, London, John Murray, 1961, pp.36f)

”پال اور دوسرے ابتدائی مسیحی مکتوب نگاروں نے یونانی زبان کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا تھا۔ اس کی ایک عملی وجہ تھی۔ ان کے زمانے میں یونانی ایک بین الاقوامی زبان تھی، جسے تاجر اور دوسرے لوگ ایک عمومی ذریعۂ اظہار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ جس طرح آج انگریزی زبان پوری دنیا میں وسیع طور پر استعمال ہوتی ہے، اور جس طرح پچھلی صدی میں فرانسیسی زبان یورپ میں ڈپلومیٹک اور دوسرے حلقوں میں استعمال ہوتی تھی، اسی طرح یونانی زبان پال کے زمانے میں بین الاقوامی طور پر مستعمل تھی۔ یہ دنیا کے بڑے بڑے شہروں کی زبان تھی اور ان لوگوں کی زبان تھی جن تک پال اور اس کے ساتھی خاص طور پر رسائی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ زبان شام اور فلسطین میں بھی نفوذ کر چکی تھی۔ موخر الذکر ملک کی زبان تو تھی ہی ارامی اور حضرت عیسیٰ بھی یہی زبان بولتے تھے۔ ... پال بھی ارامی زبان بولتا تھا، تاہم یروشلم تک میں بھی یونانی قابل لحاظ حد تک استعمال کی جانی شروع ہو گئی تھی اور پال کے لیے اس میں لکھنے یا گفتگو کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ ... پال اور اس کی طرح دوسرے بہت سے لوگ بھی اگرچہ اپنی ذاتی زبان اور کلچر سے بڑی محبت کرتے تھے، لیکن یونانی زبان میں بڑی آسانی سے اظہار خیال کرتے تھے اور غالباً اسی میں سوچتے بھی تھے۔ اس طرح یہ بالکل فطری بات ہے کہ ابتدائی مسیحیوں کا تمام ادب اسی زبان میں لکھا گیا ہوگا، کیونکہ انھیں اس بات کی کوئی وجہ نظر نہ آتی ہوگی کہ وہ کسی اور زبان میں لکھیں جب تک کہ ان کی یہ خواہش نہ ہو کہ اپنے سامعین کو ایک مختصر سے گروپ تک محدود کر لیں جو یقیناً وہ نہیں چاہتے ہوں گے۔“

ریمنڈ ای براؤن عہد نامہ جدید کے تعارف میں لکھتا ہے کہ عہد نامۂ جدید یونانی زبان میں لکھا گیا تھا:

“Readers of the NT who know Greek, the language in which it was written, can make their own informed efforts to grasp what the authors were trying to communicate. Without a knowledge of Greek, plays on words are often lost.” (Raymond E. Brown, An Introduction of NT, Bangalore, TPI, 1997, p.vii)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''عہد نامۂ جدید کے ایسے قارئین جو یونانی زبان جانتے ہیں، جس زبان میں یہ لکھا گیا تھا، خود اپنے طور پر یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ اس کا وہ مطلب اخذ کر سکیں جو اس کے مصنفین پہنچانا چاہتے تھے۔ یونانی زبان کے علم کے بغیر اکثر اوقات رعایت لفظی کا حسن ضائع ہو جاتا ہے۔''

وہ مزید لکھتا ہے:

''The NT books were written some 1,900 years ago in Greek. .... There is evidence that Matt, John, and Paul may have known Aramaic and /or Hebrew, while Mark and Luke may have known only Greek but we are far from certain.'' (Raymond E. Brown, An Introduction of NT, op.cit., p.36)

''عہد نامۂ جدید کی کتابیں قریباً ۱۹۰۰ سال پہلے یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔... اس بات کی شہادت موجود ہے کہ متی، یوحنا اور پال ارامی اور/ یا عبرانی جانتے ہوں گے، جب کہ مرقس اور لوقا صرف یونانی زبان سے واقف ہوں گے، لیکن ہم یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔''

تعارف عہد نامۂ جدید میں فیمی پرکنز کا بیان ہے کہ متی کی انجیل یونانی زبان میں لکھی گئی تھی:

''It (Matthew) was composed in Greek.'' (Pheme Perkins, NT Introduction, Bombay, St. Paul Publications 1992, p.15)

''یہ (متی کی انجیل) یونانی زبان میں مدون ہوئی تھی۔''

یہی مصنف لکھتا ہے کہ مرقس کی انجیل یونانی زبان میں لکھی گئی تھی:

''As far as we know, Mark was the first person to bring the diverse stories about Jesus together in a single narrative. Mark writes in Greek for an audience that does not understand the Aramaic words which occur in some of the stories.'' (Pheme Perkins, NT Introduction, op.cit., p.260)

''جہاں تک ہم جانتے ہیں مرقس وہ پہلا شخص تھا جس نے حضرت عیسیٰ کے متعلق متنوع کہانیوں کو مربوط اور واحد بیان کی شکل میں یکجا کیا۔ مرقس ایسے سامعین کے لیے جو بعض کہانیوں میں پائے جانے والے ان ارامی الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے تھے، یونانی زبان میں لکھتا تھا۔''

انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن (دوسرا ایڈیشن) میں بتایا گیا ہے:

''Papias and others after him consistently associated Matthew's

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

authorship with Semitic text, but Matthew is in Greek and seems unlikely to be a translation from Hebrew or Aramaic.'' (Encyclopedia of Religion, Second Edition, Ed. Lindsay Jones, Farmington Hills, USA, Macmillan, Thomsom Gale, 2005, Vol. 2, p.907)

''پاپیاس اوراس کی تقلید میں دوسرے لوگ بھی انجیل متی کی تصنیف کو ایک سامی متن سے منسلک کرتے ہیں، لیکن انجیل متی یونانی زبان میں ہے اور ایسا نظر نہیں آتا کہ یہ عبرانی یا ارامی سے ترجمہ کی گئی ہو۔''

انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن (دوسرا ایڈیشن) مزید لکھتا ہے:

''None of the original Greek New Testament survives. The documents presumably wore out.'' (Encyclopedia of Religion, Second Edition, op.cit., Vol.2, p.921)

''اصلی یونانی عہد نامۂ جدید میں سے کوئی بھی نہیں بچا رہ سکا۔ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ یہ تمام دستاویزات بوسیدہ اور ناکارہ ہو گئیں۔''

اسی انسائیکلو پیڈیا آف ریلجن (دوسرا ایڈیشن) میں مزید واضح کیا گیا ہے کہ اگرچہ حضرت عیسیٰ آرامی زبان بولتے تھے، تاہم عہد نامہ جدید کی تمام کتابیں یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں:

''Although Jesus spoke Aramaic, all of the NT documents were composed in Greek. Begnning in second century, the spread of Christianity required translating the Greek into other languages. ... In the fifth century a Syriac Version of the NT, lacking only 2 Peter, 2 and 3 John, Jude, and Revelation, was published. This, known as the Peshitta, was revised in the VI and VII century, when the missing five books were added.'' (Encyclopedia of Religion, Second Edition, op.cit., Vol. 2, p.922)

''اگرچہ حضرت عیسیٰ ارامی زبان بولتے تھے، مگر عہد نامہ جدید کی تمام دستاویزات یونانی زبان میں مدون ہوئی تھیں۔ دوسری صدی میں شروع ہونے والی مسیحیت کی اشاعت کا تقاضا تھا کہ یونانی زبان کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ ... پانچویں صدی میں عہد نامۂ جدید کا ایک سریانی ترجمہ شائع ہوا تھا، جس میں سے صرف ''۲ پطرس''، ''۳ یوحنا''، یہوداہ اور مکاشفہ غائب تھے۔ اس [سریانی ترجمے] پر جو پشیتا کے نام سے مشہور ہے، چھٹی اور ساتویں صدیوں میں نظر ثانی کی گئی تھی اور اسی دوران میں ان پانچ کتابوں کا اضافہ بھی کر دیا گیا تھا۔''

www.javedahmadghamidi.com www.ghamidi.net

دی سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ بائبل کمنٹری نے بھی یہی بات کہی ہے کہ عہد نامہ جدید کی تمام کتابوں کے متعلق یہی یقین کیا جاتا ہے کہ وہ یونانی میں لکھی گئی تھیں:

"The 27 books of the New Testament are generally believed to have been composed in Greek. In the time of Christ and the apostles Greek was the universal language of the Roman Empire. It had spread throughout the World toward the end of the 4th century B.C. with the expansion of Alexander's empire. His successors were all Greek rulers, who supported the spread of Greek speech and culture. Thus Greek became so widely known and deeply rooted that the Romans, who built an empire in the 1st century B.C. from the Atlantic to Persia, could not suppress it. Latin gained predominance in North Africa, Spain and Italy, but played no role in the Eastern world. Even in Italy, where Latin was the mother tongue, educated people, especially, used Greek as a second language. For example, the Epistle of Clement, the earliest Christian document outside of the New Testament, though written in Rome, was composed in Greek. ... However, other languages besides Greek were used in different parts of the empire. Thus, for exapmle, the Jews of Palestine spoke Aramaic, the People of Lystra, Lycaonian (Acts 14:11), and the population of the city of the Rome, Latin. This multilingual situation is reflected in the trilingual inscription above the cross on Calvary, composed in (1) Aramaic (called Hebrew in the New Testament), the language of the country, (2) Greek, the universally understood language of the empire, and (3) Latin, the offical language of the Roman administratin (John 19:20). Similar conditions existed in modern Palestine during the period of British mandate before the emergence of Israel as a state, when, for example, postage stamps contained imprints in three languages and scripts: Hebrew, Arabic, and English. This practice has been continued on postage stamps of the state of Israel." (The Seventh-day Aventist Bible Commentary, Ed. Francis D.

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

Nichol, Hagerstown, Review and Herald Publishing Association, 1980, Vol. 5 pp.103f)

''عہد نامۂ جدید کی ۲۷ کتابوں کے متعلق عام طور پر اس یقین کا اظہار کیا جاتا ہے کہ یہ یونانی زبان میں مدون ہوئی تھیں۔ حضرت مسیح اور حواریوں کے زمانے میں یونانی رومن امپائر کی بین الاقوامی زبان تھی۔ چوتھی صدی ق م کے اختتام تک سکندر اعظم کی سلطنت کی توسیع کے ساتھ یہ پوری دنیا میں پھیل چکی تھی۔ سکندر کے سارے جانشین یونانی حکمران تھے، جو یونانی زبان اور کلچر کی اشاعت میں تعاون کرتے تھے۔ اس طرح یونانی زبان اتنے وسیع حلقے میں سمجھی جانے لگی اور اس کی جڑیں اتنی مضبوط ہوگئیں کہ رومی جنھوں نے پہلی صدی ق م میں بحر اوقیانوس سے ایران تک ایک سلطنت قائم کر لی تھی، اسے دبا نہ سکے۔ لاطینی زبان نے شمالی افریقہ، سپین اور اٹلی میں غلبہ حاصل کر لیا، لیکن مشرقی دنیا میں اس کا کوئی کردار نہ تھا۔ اٹلی تک میں، جہاں لاطینی مادری زبان تھی، بالخصوص تعلیم یافتہ لوگ ثانوی زبان کے طور پر یونانی استعمال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر کلیمنٹ کا خط جو عہد نامۂ جدید سے باہر اولین مسیحی دستاویز تھی، وہ اگرچہ روم میں لکھا گیا تھا، لیکن مدون یونانی زبان میں ہوا تھا۔... تاہم رومی سلطنت کے مختلف حصوں میں یونانی زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانیں بھی مستعمل تھیں۔ مثال کے طور پر فلسطین کے یہودی آرامی زبان بولتے تھے، لسٹرا کے لوگ لائیکونین اور روم کے شہر کی آبادی لاطینی زبان بولتی تھی۔ کالوری میں صلیب پر کندہ سہ لسانی کتبے سے اس کثیر اللسان صورت حال کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ کتبہ (۱) ملک کی زبان ''آرامی' (۲) سلطنت روما کے اندر بین الاقوامی طور پر سمجھی جانے والی زبان ''یونانی'' اور (۳) رومن انتظامیہ کی دفتری زبان ''لاطینی'' میں ترتیب دیا گیا تھا۔ اس طرح کے حالات اسرائیلی ریاست کے قیام سے پہلے برطانوی انتداب کے دور میں جدید فلسطین میں پائے جاتے تھے، جب، مثال کے طور پر، ڈاک کے ٹکٹوں پر تین زبانوں اور رسوم الخط کی چھاپ ہوتی تھی: عبرانی، عربی اور انگریزی۔ ریاست اسرائیل کے ڈاک کے ٹکٹوں میں بھی یہی مشق جاری رہی۔''

بلیورز بائبل کمنٹری دی نیوٹسٹامنٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ عہد نامہ جدید روزمرہ کی عام یونانی زبان (کوائنی) میں لکھا گیا تھا:

''The New Testament was written in everyday language (called koine, or "common Greek"). This was a nearly universal second language in the first century of Faith, as well-known and as widely used as English is today.'' (Willian Macdonald, Believers Bible Commentary New Testament, Kansas, A & O Press, P. O. Box 8550, 1989, p.11)

''عہد نامۂ جدید روزمرہ کی زبان میں (جسے کوائنی یا عوامی یونانی زبان کہا جاتا تھا) لکھا گیا تھا۔ یہ عہد ایمان کی

پہلی صدی میں قریباً بین الاقوامی ثانوی زبان تھی۔ یہ اتنی مشہور عام اور وسیع حلقے میں استعمال کی جاتی تھی، جتنی آج کے دور میں انگریزی ہے۔''

میرٹ سٹوڈنٹس انسائیکلو پیڈیا میں بھی یہی بات کہی گئی ہے:

''The books of the New Testament, which were written in the 1st century A.D., describe early Christianity. All the books, with perhaps one or two exceptions, were written in Greek, the most widely spoken language in Middle East at the time.'' (Merit Students Encylopedia, Ed. Bernard S. Cayne, USA, Crowell-Collier Educational Corporation, 1967, Vol. 3, p.135)

''عہد نامۂ جدید کی کتابیں جو پہلی صدی عیسوی میں لکھی گئی تھیں، ابتدائی دور کی مسیحیت کو بیان کرتی ہیں۔ شاید ایک یا دو کے استثنا کے ساتھ تمام کتابیں یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں، جو اس دور کی مشرق وسطیٰ میں سب سے زیادہ وسیع علاقے میں بولی جانے والی زبان تھی۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں بھی یہ بات تفصیل سے بیان کی گئی ہے:

''On the whole it appears to be the more probable view that the literary stage in the transmission of the Gospel materials belongs, in the main, to Greek-speaking Christianity, the evidences of "translation Greek" being due not to actual translation from documents, but to the originally Semitic character of the tradition, and to the fact that it was in the first instance "done into Greek" by interpreters whose native speech was Semitic. The Aramaic-speaking Church of Jerusalem, the original fountain-head of the tradition, was in all probability for a considerable period of the same mind as the early second century writer Papias....

On the other hand, it is probable that in Greek-speaking circles the work of Christian teachers and catechists was at a very early stage helped by the use of written materials as an aid to the memory. Collections of the sayings and parables of Jesus were probably made, and perhaps collections of short narratives also. There were therefore written materials available when the Gospels came to be compiled, for the most

part probably in the form rather of catechists' notes than of "books" in any literary sense.'' (Encyclopaedia Britannica, Chicago, Encyclopaedia Britannica, Inc., 1953, Vol. 10, p.537)

''مجموعی طور پر اس نظریے کا امکان غالب دکھائی دیتا ہے کہ انجیلی مواد کی منتقلی کا ادبی مرحلہ بڑی حد تک یونانی بولنے والی مسیحیت سے تعلق رکھتا ہے۔ ''ترجمے والی یونانی'' کی جھلک کی وجہ یہ نہیں کہ یہ فی الواقع کچھ دستاویزات سے ترجمہ کیا گیا ہے، نہیں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ روایت ابتداءً سامی مزاج کی ہے اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ ایسے تاویل نگاروں کی طرف سے یونانی میں پایۂ تکمیل تک پہنچائی جانے والی کاوش ہے، جن کی مقامی بولی سامی تھی۔ اس روایت کا اصلی سرچشمہ یعنی ارامی بولنے والا یروشلم کا چرچ، قابل لحاظ وقت تک غالباً اسی ذہنیت پر کاربند تھا، جیسی دوسری صدی کے مصنف پاپیاس کی تھی...۔

دوسری طرف غالب امکان یہ ہے کہ یونانی بولنے والے حلقوں میں مسیحی مربیوں اور مکالماتی معلموں کے کام میں بہت ابتدائی دور میں حافظے کی مدد کے طور پر تحریری مواد کو استعمال میں لایا گیا ہوگا۔ غالباً حضرت عیسیٰ کے ملفوظات اور تمثیلات کے مجموعے ترتیب دیے گئے تھے اور شاید مختصر واقعاتی بیانات کے مجموعے بھی مرتب کر دیے گئے تھے۔ اس طرح جب انجیلیں ترتیب دی جانے لگیں تو تحریری مواد دستیاب تھا، لیکن ان کا بڑا حصہ غالباً مکالماتی معلموں کے ''نوٹس'' کی شکل میں تھا، نہ کہ کسی ادبی اعتبار سے ''کتابوں'' کی صورت میں۔''

دی اینوٹیٹڈ پیراگراف بائبل کے عہد نامۂ جدید کا تعارف نگار لکھتا ہے کہ سارے کا سارا عہد نامۂ جدید یونانی زبان میں لکھا گیا تھا:

''The NT is all written in the Greek language: and is wholly in prose, although a few portions have some of the poetical rhythm of the ancient Hebrew.'' (The Annotated paragragh Bible, London: The religious Tract Society, 1866, p.1052)

''عہد نامۂ جدید سارے کا سارا یونانی زبان میں لکھا گیا ہے اور سارا نثر میں ہے۔ تاہم چند ایک اجزا میں قدیم عبرانی نظم کا آہنگ بھی موجود ہے۔''

دی لائن ہینڈ بک ٹو دی بائبل نے واضح طور پر لکھا ہے کہ (حضرت عیسیٰ نے) ابتداءً انجیلی مواد کی تعلیم آرامی زبان میں دی تھی:

''The Gospel material was originally taught in Aramic, the language spoken by Jesus, and in a poetic form which was easy to memorize.''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

(The Lion Hand Book to the Bible, Special Edition, Ed. David and Pat Alexander Herts, England, Lion Publishing, 1973, p. 469)

''ابتدائی طور پر انجیلی مواد کی تعلیم حضرت عیسیٰ کی طرف سے بولی جانے والی زبان آرامی میں دی گئی تھی اور یہ نظم کی صورت میں تھی جس کا یاد رکھنا آسان تھا۔''

اس طرح متعدد حوالوں سے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ (۱) حضرت عیسیٰ اگرچہ یونانی زبان سے بھی واقفیت رکھتے تھے، لیکن انھوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا پیغام آرامی زبان ہی میں پیش کیا تھا اور (۲) اناجیل شروع ہی سے یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ مندرجہ بالا حوالوں کے مطالعے کے بعد ''محدث'' کے محترم مضمون نگار کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں رہے گی کہ ''اگر وہ اس سلسلہ میں کوئی ایک مستند حوالہ یا کوئی ٹھوس تاریخی ثبوت پیش کر دیتے تو قارئین کے لیے تحقیق کی راہ آسان ہو جاتی۔'' امید ہے ان اقتباسات کے مطالعے سے ان' کے لیے تحقیق کی راہ آسان ہو جائے گی۔ جناب محمد اسلم صدیق لکھتے ہیں:

''اس کے لیے غوری صاحب کا مولانا مدنی کو علامہ قسطلانیؒ پر اندھا اعتماد کرنے کا طعنہ دینا بھی درست نہیں ہے، کیونکہ مولانا سے جو سوال کیا گیا تھا، وہ محض اسی قدر تھا کہ 'کیا سریانی نام کی کسی زبان کا وجود ہے؟' اور اس سوال کے جواب میں مولانا مدنی نے علامہ قسطلانی کی عبارت سے استدلال کر کے بتایا کہ ہاں سریانی زبان کا وجود ہے۔ اس حد تک آپ کو بھی اختلاف نہیں۔ مولانا کے پیش نظر یہ تحقیق ذکر کرنا تھا ہی نہیں کہ انجیل کی زبان کیا تھی؟ [اگر 'مولانا کے پیش نظر یہ تحقیق ذکر کرنا تھا ہی نہیں کہ انجیل کی زبان کیا تھی؟' تو پھر انھوں نے علامہ قسطلانی کا حوالہ دینے کی زحمت گوارا ہی کیوں کی تھی؟] پھر انھیں متعلقہ کتب یا اہل علم سے رجوع کا مشورہ چہ معنی دارد۔ اس نوعیت کے سوال جواب سے ایک بحث کا آغاز کر لینا جو سائل کا مطلوب و مقصود بھی نہیں، اشراق کے تحقیق کار کا عجب طرز عمل ہے!''

جہاں تک اس اقتباس کے پہلے جملے کے حصہ اول کا تعلق ہے تو گزارش یہ ہے کہ اگر میری تحریر سے طعنے کا مفہوم نکلتا ہے، تو میں صمیم قلب سے حضرت مولانا ثناء اللہ مدنی سے معافی کا طالب ہوں۔ مولانا مدنی کا میں ذاتی طور پر بہت احترام کرتا ہوں۔ پچھلے دو عشروں سے ان کے فتاویٰ ''الاعتصام'' اور ''محدث'' میں بڑے شوق سے دیکھتا رہا ہوں، بلکہ ان موقر جریدوں میں سب سے پہلے مولانا مدنی کے فتاویٰ ہی کا مطالعہ کیا کرتا ہوں۔ یہ میری نالائقی ہے کہ ایسے بزرگ جید عالم دین کے متعلق مجھ سے ایسا جملہ لکھا گیا جس سے ان کی شان میں گستاخی کا شائبہ نکلتا ہو۔

جہاں تک جملے کے بقیہ حصے (کیونکہ مولانا سے جو سوال کیا گیا تھا، وہ محض اسی قدر تھا کہ 'کیا سریانی نام کی کسی زبان کا وجود ہے؟' اور اس سوال کے جواب میں مولانا مدنی نے علامہ قسطلانی کی عبارت سے استدلال کر کے بتایا

کہ ہاں سریانی زبان کا وجود ہے۔) کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ سائل کے سوال کا مکمل جواب مولانا کے پہلے فقرے میں موجود ہے کہ 'سریانی مستقل زبان کا نام ہے۔' آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ 'اس سوال کے جواب میں مولانا مدنی نے علامہ قسطلانی کی عبارت سے استدلال کرکے بتایا کہ ہاں سریانی زبان کا وجود ہے۔' تو یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ علامہ قسطلانی کی عبارت سے سریانی زبان کے مستقل وجود کا استدلال کیسے بنتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا مدنی نے جواب میں ایک زائد بات بیان کی ہے کہ انجیل بھی سریانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ یہ انداز تحریر اپنی جگہ بالکل قابل اعتراض نہیں، بلکہ بعض اوقات ایسی زائد معلومات کے ذریعے سے بات کی وضاحت زیادہ بہتر طور سے ہو جاتی ہے۔ وجہ اعتراض تو دراصل یہ بات بنی ہے کہ 'انجیل اصلاً سریانی زبان میں لکھی گئی تھی۔' یہ جو کہا گیا ہے کہ 'مولانا کے پیش نظر یہ تحقیق ذکر کرنا تھا ہی نہیں کہ انجیل کی زبان کیا تھی؟ پھر انھیں متعلقہ کتب یا اہل علم سے رجوع کا مشورہ چہ معنی دارد۔' تو اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اگر 'مولانا کے پیش نظر یہ تحقیق ذکر کرنا تھا ہی نہیں کہ انجیل کی زبان کیا تھی؟' تو انھوں نے بلاوجہ ایک بے تحقیق بات لکھنے کی زحمت کیوں فرمائی۔

پیرے کے آخری فقرے میں مضمون نگار رقم طراز ہیں: 'اس نوعیت کے سوال جواب سے ایک بحث کا آغاز کر لینا جو سائل کا مطلوب ومقصود بھی نہیں، ''اشراق'' کے تحقیق کار کا عجب طرز عمل ہے!' اس فقرے کے سلسلے میں غالباً ہر قاری یہ محسوس کرے گا کہ اس کا انداز بیان طنز سے خالی نہیں۔ مولانا مدنی سے ایک جملے میں سوال کیا گیا تھا۔ انھوں نے اس کا ایک ہی جملے میں بالکل صحیح جواب دے دیا۔ لیکن اپنی دانست میں انھوں نے اس جواب کی مزید وضاحت کی ضرورت محسوس کی۔ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی، یہ الگ بات ہے کہ وہ وضاحت صحیح معلومات پر مبنی نہ تھی۔ اور ایسا بڑے بڑے صاحب علم بزرگوں کی تحریروں میں ہو جانا کوئی انہونی بات نہیں۔ ''اشراق'' میں شائع شدہ مضمون میں بھی کسی بات کی وضاحت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے جو کچھ لکھا گیا وہ ایک ضروری اور متعلقہ بحث تھی، تاکہ قارئین کو موضوع سے متعلق تفصیلی معلومات سے متعارف کرایا جا سکے۔ اس پر ''اشراق'' کے تحقیق کار کا عجب طرز عمل ہے!' کی پھبتی سے اگر مضمون نگار کی تسکین ہوتی ہے، تو میں بھی اس سے محظوظ ہونے سے گریز نہیں کرتا۔ البتہ قارئین دسمبر ۲۰۰۵ کے اشراق والے میرے مضمون کو دیکھ کر جناب مضمون نگار کے طنز کا خود جائزہ لے سکتے ہیں۔ محترم مضمون نگار لکھتے ہیں:

> ''اس سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ غوری صاحب نے اس مسئلہ پر دلائل دینے کی بجائے بات کو مزید آگے پھیلاتے ہوئے سارا زور تحقیق اس بات پر صرف کر دیا کہ [حضرت] عیسیٰ کے جو ارشادات بائبل کے

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

عہد نامۂ جدید کی چاروں انجیلوں اور دیگر تحریروں میں درج ہیں وہ کبھی بھی اپنی اصلی حالت میں نہیں لکھے گئے تھے... ان کی ابتدا ہی یونانی ترجمہ سے ہوئی... وغیرہ وغیرہ ــــــ حالانکہ نہ علامہ قسطلانیؒ نے اس بحث کو چھیڑا ہے اور نہ مولانا مدنی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور پھر یہاں بھی وہی بے لچک اور غیر معروضی انداز تحقیق جیسے یہ ایک 'مسلمہ حقیقت' ہے اور اس میں کسی دوسری رائے کی گنجائش نہیں ہے۔''

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ میں نے اس مقام پر اپنا 'سارا زور تحقیق صرف کر دیا ہے'، تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ میرا مضمون ایک عام سے شذرے یا تبصرے کی نوعیت کا تھا۔ اسی وجہ سے اسے حوالوں سے گراں بار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اگرچہ جو کچھ لکھا گیا تھا وہ صرف سنی سنائی باتوں یا ناقص معلومات پر مبنی نہیں تھا۔ میں اب بھی زور دے کر اپنی بات دہراتا ہوں کہ '[حضرت] عیسیٰ کے جو ارشادات بائبل کے عہد نامۂ جدید کی چاروں انجیلوں اور دیگر تحریروں میں درج ہیں وہ کبھی بھی اپنی اصلی حالت میں نہیں لکھے گئے تھے ... ان کی ابتدا ہی یونانی ترجمہ سے ہوئی... '۔ البتہ اپنے گزشتہ مضمون میں اس پر کوئی 'زور تحقیق' صرف نہیں کیا تھا۔ موجودہ مضمون میں کسی حد تک اس کی تلافی کر دی گئی ہے اور اوپر پچیس کے قریب مستند اقتباسات پیش کر دیے گئے ہیں۔ یہ بات چار پانچ اقتباسات کے ذریعے سے بھی بیان کی جا سکتی تھی، لیکن شاید اس طرح فاضل مضمون نگار مطمئن نہ ہو پاتے۔ ان اقتباسات میں جہاں بالجزم یہ بات متفقہ طور پر دہرائی گئی ہے کہ 'حضرت عیسیٰ کی بول چال کی زبان آرامی تھی، لیکن عہد نامہ جدید ابتدا ہی سے یونانی زبان میں ضبط تحریر میں لایا گیا تھا'، وہیں ان اقتباسات سے کچھ دوسری ضروری معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ 'حالانکہ نہ علامہ قسطلانی نے اس بحث کو چھیڑا ہے اور نہ مولانا مدنی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے'۔ ''محدث'' کے محترم مضمون نگار کا یہ دعویٰ حقائق اور ریکارڈ کے خلاف ہے۔ مولانا مدنی نے انجیل کی زبان سریانی ثابت کرنے ہی کے لیے علامہ قسطلانی کی ''ارشاد الساری'' سے یہ حوالہ نقل کیا ہے کہ 'و قیل أن التورة عبرانية و الانجيل سريانی '۔'' کہا جاتا ہے کہ تورات عبرانی اور انجیل سریانی زبان میں تھی۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محترم مضمون نگار نے ''الاعتصام'' (۲ تا ۸ ستمبر ۲۰۰۵) میں مولانا مدنی کا 'جواب' ملاحظہ ہی نہیں فرمایا۔ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ مولانا مدنی کے جواب اور اس میں دیے گئے ''ارشاد الساری'' کے اقتباس ہی کے حوالے سے لکھا ہے۔ باقی رہا مضمون نگار کا یہ ارشاد 'اور پھر یہاں بھی وہی بے لچک اور غیر معروضی انداز تحقیق جیسے یہ ایک 'مسلمہ حقیقت' ہے اور اس میں کسی دوسری رائے کی گنجایش نہیں ہے۔' تو میں نے اپنے علم کی حد تک درست معلومات پیش خدمت کرنے کی کوشش کی تھی اور اس میں جہاں لچک ہونی چاہیے تھی وہاں اس کا اظہار کرنے کی بھی کوشش کی گئی

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

تھی، لیکن جہاں کوئی چیز میرے خیال میں یقینی تھی، وہاں اسے خواہ مخواہ مشکوک یا کمزور بنانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں ''محدث'' کے فاضل مضمون نگار کی نیت پر کوئی حرف زنی کیے بغیر گزارش ہے کہ بعض جگہ میں نے کوئی بات امکانی انداز میں لکھی تھی، جس کے متعلق کسی ایک پہلو پر میں یقینی بات نہیں کہہ سکتا تھا، وہاں میں نے اپنا فقرہ ''لیکن غالباً'' جیسے احتمالی الفاظ سے شروع کیا۔ فاضل مضمون نگار نے اسے بالکل حذف کر کے نقل کر دیا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آگے بیان کی جانے والی بات میں ایک یقینی مسلمے کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔ مثلاً میں نے دسمبر ۲۰۰۵ کے ''اشراق'' والے مضمون میں صفحہ ۳۴ کی سطر ۱۸ تا ۲۰ پر لکھا تھا 'لیکن غالباً یہ اس علاقے میں حضرت عیسیٰ کی آمد سے پہلے بھی رائج تھی۔ ... کہ وہ اپنے مذہب اور ثقافت کو بازنطینی اثرات سے بچا سکیں'۔ فاضل مضمون نگار نے مارچ ۲۰۰۶ کے محدث میں صفحہ ۱۲۶، سطر ۱۸ تا ۲۱ پر میری یہی عبارت بطور اقتباس نقل کی ہے، لیکن اس میں سے ''لیکن غالباً'' کے میرے الفاظ حذف کر کے اقتباس کی یہ شکل بنا دی ہے: 'یہ (سریانی) اس علاقے میں حضرت عیسیٰ کی آمد سے پہلے بھی رائج تھی۔ ... کہ وہ اپنے مذہب اور ثقافت کو بازنطینی اثرات سے بچا سکیں'۔ اس کے علاوہ بھی بعض مقامات پر احتمالی جملے درج کیے گئے ہیں مثلاً مذکورہ ''اشراق'' صفحہ ۳۶ پر سطر ۵ میں لکھا گیا ہے 'اگرچہ اسے بھی مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل نہیں۔' اس کے باوجود بھی ''وہی بے لچک اور غیر معروضی انداز تحقیق جیسے یہ ایک 'مسلمہ حقیقت' ہے اور اس میں کسی دوسری رائے کی گنجایش نہیں ہے۔'' کا الزام یک طرفہ کارروائی ہی قرار دی جا سکتی ہے۔

میں نے اپنے مضمون کے آخری سے پہلے پیراگراف میں گزارش کی تھی:

''مولانا مدنی کے اس جواب کے آخری پیراگراف کا پہلا جملہ ہے 'عربانی زبان کی اصل سریانی ہے'۔ یہاں کمپوزنگ کی غلطی ہو گئی ہے، کیونکہ 'عربانی' نام کی کوئی زبان کبھی سنی نہیں گئی۔ اصل لفظ غالباً 'عربی' ہو گا یا پھر 'عبرانی'۔ اگر کہا جائے 'عبرانی زبان کی اصل سریانی ہے' تو یہ بات محل نظر ہے۔ البتہ یہ بات بالعموم درست مانی جاتی ہے کہ عربی زبان سریانی سے کافی متاثر ہوئی ہے یا یہ کہ اس کی اصل سریانی ہے۔ اگرچہ اسے بھی مسلمہ حقیقت کی حیثیت حاصل نہیں۔ مولانا مدنی نے یہ بات 'فاکہی' کی ''اخبار مکہ'' کے حوالے سے لکھی ہے۔ بہتر ہو گا کہ جریدے کی قریبی اشاعت میں اصل ماخذ سے رجوع کر کے اس کی وضاحت کر دی جائے۔''

لیکن فاضل مضمون نگار نے اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا۔

آرامی زبان کے متعلق انسائیکلو پیڈیا آف جوداازم کے مقالہ نگار پال فلیشر (Paul Flesher) نے بڑی عالمانہ تحقیق کی ہے۔ اس کے چند اقتباسات ذیل میں دیے جاتے ہیں:

''The language of Aramaic first became important to Jews during the

Assyrian period. From the eighth ecntury B.C.E., to the fall of the Persian Empire, in the fourth century, Aramaic was the language of three empires that dominated the greater Mesopotamian world, namely, Assyria, Babylonia, and Persia. For those four-hundred years, the fortunes of Israel and Judah/Judea were firmly under the control of those empires. Aramaic became so influential within Judaism during this time that even after Greek became the language of Govenment, Aramaic continued to be used among Jews for more than a thousand years. Indeed the most important Jewish writtings in Aramaic the Aramaic Dead Sea Scrolls, parts of the Palestinian and Babylonians Talmuds and other Rabbinic literature, the translations of Scripture called the Targums, and even the Zohar come from the centuries after Aramaic lost its imperial support.

Languages are used by people. They do not exist in a vacuum but in connection with human lives. As such, they are subject to the same historical and cultural forces as other human creations. This article studies the growth of Aramaic and the development of its dialects in the context of the history of the Jews and their geographical locations and migrations. ...

After the destruction of the Jerusalem Temple in 70 C.E., Aramaic-speaking jewry splits into two groups, one remaining in Palestine and the other moving to Babylonia. ...

Aramaic was first spoken by the Aramean tribes who came to historical prominence during the eleventh century B.C.E. in Syria and Upper Mesopotamia several Ararmean tribes established small, independent kingdoms in this region, where they bore the brunt of the later Assyrian expansion to the west. The longest-surviving Aramean state, Aram, had its capital in Damascus, and remained independent until 732 B.C.E., falling to the Assyrians at the same time as the northern kingdom of Israel.

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

The period of Old Aramaic extends slightly beyond the time of the independent Aramean states, from eleventh century B.C.E. down to the start of the seventh. A few inscriptions and other written texts are known from the tenth century onwards, scattered across this region.

Although there is no evidence Israelites used Aramaic in this period, Northern Palestine, which was frequently under the control of Aram during the 9th and 8th centuries, has produced some Aramaic material. Two recent finds are particularly intriguing. The first is the Tel Dan stele, which tells of the victory of a king of Aram, perhaps Hazael, over Israel and the "king of the house of David" in the 9th century. This is the only known, contemporary reference to the Davidic dynasty outside the Hebrew Bible. The second find is the Deir Alla text from northern Jordan. ...

During the Assyrian Empire (more properly called the Neo-Assyrian Empire), Aramaic replaced Akkadian as the language of the imperial administration. An Eastern dialect of Aramaic was chosen for this role and its spread throughout the Empire brought previously unknown linguistic forms to the Empire's western reaches, particularly areas on the Mediterranean Sea such as Syria, Palestine and Egypt. This dialect, known to scholars as Imperial Aramaic (also called official Aramaic and Reichsarmaisch), became a standard for both spoken and written communication.

Scholars generally date this period from the start of the 7th century B.C.E. down to about 200 B.C.E. The general process by which Imperial Aramaic became dominant is clear, if not fully known in detail. The Assyrian King Tiglath-Pileser III, who ruled from 744 to 727, first made Aramaic into the language of governance. He brought Aramean scribes into his administration to be in charge of the correspondence across the empire. The spread of Aramaic was assisted by the deportation of

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

conquered Aramean populations throughtout the empire and through its use by imperial administrators and military garrisons.

The first evidence for knowledge of Aramaic among the Israelites comes from the siege of Jerusalem ordered by King Sennacherib in 701 B.C.E. This took place when King Hezekiah ruled Judah (to 2 Kgs. 18:13-27). During the siege, the Assyrian ambassadors stood outside the city and negotiated with Hezekiah's representatives standing on the city wall by shouting in Hebrew. When Israelite officials asked them to speak in Aramaic because although they knew it, the average citizen did not, the Assyrians refused. They preferred to use their fluency in the local language to enable their threats to be understood by everyone, rather than to negotiate in the language of the empire.'' (The Encyclopedia Of Judaism, Second Edition, Ed. Jacob Neusner etc., Brill, 2005, Vol. I, pp. 85,86)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''آرامی زبان نے یہودیوں کے لیے سب سے پہلے اشوریوں کے دور میں اہمیت حاصل کی۔ آٹھویں صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی ق م میں فارسی سلطنت کے زوال تک آرامی زبان ان تین سلطنتوں کی زبان تھی، جن کا عظیم تر میسو پوٹیمیا پر تسلط تھا یعنی اشوری، بابلی، اور فارسی۔ ان چار سو سالوں کے دوران میں اسرائیل اور یہودیہ کی قسمت انھی سلطنتوں کے مکمل کنٹرول میں تھی۔ اس عرصے کے دوران میں آرامی زبان کا یہودیت پر اتنا گہرا اثر تھا کہ یونانی کے سرکاری زبان بن جانے کے بعد بھی آرامی زبان یہودیوں میں ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے تک رائج رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہودیت کی انتہائی اہم آرامی تحریریں مثلاً بحیرۂ مردار کے آرامی زبان میں لکھے گئے طومار، فلسطینی اور بابلی تالمودوں کے بعض اجزا، ربیوں کی دیگر تحریریں، اور صحائف کے [آرامی زبان میں] تراجم، جنھیں 'ترجوم' کہا جاتا ہے وغیرہ اگرچہ آرامی زبان میں لکھے گئے ہیں، تاہم یہ اس دور میں لکھے گئے ہیں جب آرامی زبان کو شاہی سرپرستی بالکل حاصل نہیں رہی تھی۔

زبانیں انسان استعمال کرتے ہیں۔ وہ خلا میں نہیں، بلکہ انسانی زندگیوں کے تناظر میں وجود پذیر ہوتی ہیں۔ اس طرح ان پر بھی وہی تاریخی اور ثقافتی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں، جو دوسری انسانی تخلیقات پر۔ اس آرٹیکل میں یہودیوں کی تاریخ اور ان کے جغرافیائی محل وقوع اور نقل مکانی کے سیاق وسباق میں آرامی زبان کے ارتقا اور اس کی ذیلی بولیوں کے نشوونما کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

۷۰ءعیسوی میں یروشلم کے ہیکل کی تباہی و بربادی کے بعد آرامی بولنے والے یہودی دو گروہوں میں منقسم ہو گئے: ایک تو فلسطین ہی میں رہ گیا اور دوسرا بابل کی طرف نقل مکانی کر گیا۔

آرامی زبان سب سے پہلے ان آرامی قبائل نے بولنی شروع کی تھی، جو تاریخی طور پر گیارھویں صدی قبل از مسیح کے دوران میں شام اور بالائی میسوپوٹیمیا میں ابھر کر سامنے آئے۔ اس خطے میں متعدد آرامی قبائل نے چھوٹی چھوٹی آزاد بادشاہتیں قائم کر لی تھیں، جہاں وہ متاخرین اشوریوں کے مغرب کی طرف توسیع پسندانہ حملوں کی سختیاں اور مصیبتیں جھیلتے تھے۔ آرامیوں کی سب سے زیادہ مدت تک باقی رہنے والی ریاست، آرام کا دارالحکومت دمشق میں تھا اور یہ ۷۳۲ قبل مسیح تک آزاد رہی۔ اسی عرصے کے دوران میں اسرائیل کی شمالی سلطنت کی طرح یہ بھی اشوریوں کے ہاتھوں شکست پذیر ہوئی۔

قدیم آرامی کا دور آزاد آرامی ریاستوں سے کچھ بعد تک پھیلا ہوا ہے: یعنی گیارھویں صدی قبل مسیح سے لے کر ساتویں صدی ق م کے آغاز تک۔ دسویں صدی سے لے کر آگے تک چند ایک کتبے اور دوسرے تحریری متن معروف و معلوم ہیں اور یہ سارے خطے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

اگرچہ اس بات کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ اس دور میں اسرائیلی لوگ آرامی زبان استعمال کرتے ہوں، تاہم شمالی فلسطین نے جو آٹھویں اور نویں صدی ق م کے دوران میں زیادہ تر آرامی سلطنت کے کنٹرول میں رہا، کچھ آرامی مواد کی تخلیق کی ہے۔ دو جدید ترین دریافتیں خاص طور پر قابل دلچسپی ہیں: پہلی تو ہے تل دان کی پتھر کی تختی، جو نویں صدی ق م میں آرام کے بادشاہ، جس کا نام شاید 'حزائیل' تھا، کی اسرائیل اور ''داؤد کے گھرانے کے بادشاہ'' پر فتح کے ذکر پر مشتمل ہے۔ عبرانی بائبل سے باہر داؤد کے خاندان کے سلسلے میں یہ واحد معروف معاصرانہ حوالہ ہے۔ اور دوسری دریافت ہے شمالی اردن سے ملنے والا 'دیرالا' کا متن۔

اشوری سلطنت (جسے جدید اشوری سلطنت کہنا زیادہ مناسب ہے) کے دوران میں سلطنت کی انتظامیہ کی زبان کے طور پر آرامی زبان نے عکادی زبان کی جگہ لے لی۔ اس سلسلے میں آرامی زبان کی ایک مشرقی بولی کا انتخاب کیا گیا تھا اور پوری سلطنت میں ہر جگہ اس کے پھیل جانے کی وجہ سے ان لسانی ہیئتوں کو جو پہلے غیر معلوم تھیں، سلطنت کی مغربی حدود، خصوصاً بحیرۂ روم پر واقع علاقوں مثلاً شام، فلسطین اور مصر تک رسائی حاصل ہو گئی۔ یہ بولی جو اہل علم کے درمیان استعماری آرامی زبان (جسے سرکاری آرامی وغیرہ بھی کہا جاتا ہے) کی حیثیت سے معروف ہے، بول چال اور تحریر، دونوں کے ذریعۂ اظہار کے لیے معیار قرار پائی۔

اہل علم اس دور کو بالعموم ساتویں صدی قبل مسیح کے آغاز سے لے کر تقریباً ۲۰۰ ق م تک شمار کرتے ہیں۔ وہ عمومی طریق کار جس کے ذریعے سے استعماری آرامی زبان نے غلبہ و تسلط حاصل کیا، اگر اپنی پوری تفصیل کے ساتھ

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

معلوم نہ بھی ہو، تاہم ایک حد تک واضح ضرور ہے۔ آرامی زبان کو سب سے پہلے حکمرانی کی زبان اشوری بادشاہ تغلث پائلسر سوم (Tiglath Pileser III) نے قرار دیا تھا، جو ۷۴۴ سے ۷۲۷ ق م تک اسیریا (Assyria) پر حکمرانی کرتا رہا۔ اس نے آرامی کاتبوں کو اپنی انتظامیہ میں شامل کیا، تاکہ انھیں پوری سلطنت میں خط کتابت کا نگران بنا دیا جائے۔ آرامی زبان کے پھیلاؤ میں مفتوحہ آرامی آبادی کو اپنے شہروں سے نکال کر پوری سلطنت میں بکھیر دینے اور سامراجی انتظامیہ اور فوجی چھاؤنیوں میں اس کے استعمال سے بڑی مدد ملی۔

اسرائیلیوں کی ارامی زبان سے آشنائی کی اولین شہادت ۷۰۱ ق م میں شاہ سینا کرب (Sennacherib) کے یروشلم کے محاصرے کے فرمان سے ملتی ہے۔ یہ واقعہ اس وقت رونما ہوا جب یہودیہ پر شاہ حزقیاہ کی حکومت تھی (۲۔ سلاطین، ۱۸: ۱۳ تا ۲۷)۔ اس محاصرے کے دوران میں اشوری ایلچی شہر سے باہر کھڑے تھے اور فصیل شہر پر کھڑے ہوئے حزقیاہ کے نمائندوں کے ساتھ عبرانی زبان میں چیخ چیخ کر گفت و شنید کر رہے تھے، جب اسرائیلی اہل کاروں نے انھیں اس بنا پر آرامی زبان میں گفتگو کرنے کے لیے کہا کہ اگرچہ وہ اسے سمجھتے تھے، مگر متوسط درجے کا شہری اسے نہیں سمجھتا تھا تو اشوریوں نے نہ مانا۔ انھوں نے اس بات کو ترجیح دی کہ مقامی زبان میں اپنی روانی اور قادر الکلامی کو اس مقصد کے لیے استعمال کریں کہ ہر آدمی ان کی دھمکیاں بآسانی سمجھ جائے، بجائے اس کے کہ سلطنت کی زبان میں گفتگو کریں۔''

انسائیکلو پیڈیا آف جوداازم کے مقالہ نگار نے اس موضوع کے ہر پہلو پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ یوں تو یہ سارا مقالہ ہی قابل مطالعہ ہے، لیکن جتنا کچھ اب تک لکھا گیا ہے بقیہ مقالہ اس سے قریباً دس گنا زیادہ ہے۔ یہاں اصل انگریزی عبارت چھوڑتے ہوئے اس کے صرف اہم نکات ہی بیان کیے جاتے ہیں:

''بابلی سلطنت اسرائیلوں کی آرامی زبان سے واقفیت کے سلسلے میں بہت بڑی حد تک اثر انداز ہوئی۔ ۵۸۶ ق م میں اہل بابل نے یروشلم پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے طبقۂ اشرافیہ کو اسیر بنا کر اپنے ساتھ بابل میں لے گئے۔ وہاں اسرائیلی ایک ایسی سوسائٹی میں گھر کر رہ گئے تھے جو اپنی روزمرہ کی زندگی میں آرامی زبان کا وسیع استعمال کرتی تھی۔ جب اہل فارس نے بابلی سلطنت ختم کی اور جلا وطن یہودیوں کو یروشلم جانے کی اجازت دی تو وہ بظاہر عبرانی کے مقابلے میں آرامی زبان زیادہ روانی سے بولتے تھے۔ بلکہ وہ عبرانی زبان بھی آرامی رسم الخط میں لکھتے تھے۔ موجودہ عبرانی حروف ابجد اسی آرامی رسم الخط سے ماخوذ ہیں۔

آرامی زبان کا درمیانی دور بالعموم دوسری صدی قبل مسیح سے تیسری صدی عیسوی کے آغاز تک پھیلا ہوا ہے۔ کتبوں اور آثار قدیمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دور میں اسرائیل کے قرب و جوار کے ممالک میں تین بولیاں رواج پا رہی تھیں: (۱) شمال مغربی عرب، صحرائے نجف، جنوبی اور جنوب مشرقی فلسطین میں نبطی بولی رائج تھی۔ (۲) شام

کے تجارتی شہر پلمائرا (Palmyra) کے زیر اثر علاقوں میں پالمائرین (Palmyrene) بولی کا دور دورہ تھا اور یہ علاقہ بحیرۂ روم کے ساحل اور دریاے فرات دونوں سے نصف فاصلے پر واقع تھا۔ (۳) سریانی زبان کے ظہور کی ابتدائی شہادت شمالی شام میں ایڈیسہ (Edessa) کے اردگرد ملتی ہے۔ یہ تمام بولیاں شاہی آرامی زبان اور علاقے کی مقامی بولیوں کے اختلاط سے وجود میں آئی تھیں اور غالباً مقامی بولیوں کا اثر زیادہ تھا۔'' (انسائیکلو پیڈیا آف جوداازم، ایڈیشن دوم، ایڈیٹر جیکب نیوسنر وغیرہ، برل، ۲۰۰۵ء، جلد اول، صفحہ ۸۶۔ ۹۴)

اوپر متعدد مستند حوالوں سے یہ واضح کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ کی عام بول چال کی زبان آرامی تھی، لیکن اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ یونانی زبان بھی بخوبی جانتے ہوں۔ انھی حوالوں سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ انجیل ابتدائی طور پر یونانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس کے بعد انسائیکلو پیڈیا آف جوداازم کے آرامی زبان پر ایک مبسوط مقالے سے آرامی زبان کی تاریخ کے متعلق اقتباسات نقل کیے گئے۔ ذیل میں یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ مسلم علما اور شارحین بخاری نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ انجیل سریانی میں لکھی گئی تھی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یونانی انجیل ابتدا میں سریانی زبان میں نہیں لکھی گئی تھی، بلکہ سریانی زبان میں اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ دوسری اور چوتھی صدی عیسوی میں ہوا تھا اور بعد کی دو تین صدیوں میں بھی یہ عمل جاری رہا۔ میک گریگر لکھتا ہے:

''The New Testament books, widely circulated in Greek, were translated at a very early date into other languages. ... As early as about A.D. 150 the NT was translated into Syriac and into Latin, ... Syriac is a dialect of Aramaic, Christ's native tongue, and was the language of Mesopotamia and Syria. It is known that in Edessa, in the valley of Euphrates, between about A.D. 150 and 175, a work was circulating known as the Diatessaron. ... it was the work of a scholar called Tatian who was a native of Euphrates Valley where he was born about A.D. 110. ... His work was probably written in Rome and taken to Syria, where it was translated into Syriac, and it is known that this translation was chief form in which the Gospel story was circulated in Syria till the fourth century.'' (Geddes MacGregor, The Bible in the Making, London, John Murray, 1961, pp.57f.)

''عہد نامۂ جدید کی کتابوں کا، جن کی یونانی زبان میں وسیع پیانے پر اشاعت ہو رہی تھی، بہت ابتدائی دور میں

دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو گیا تھا۔... ۱۵۰ عیسوی ہی تک عہد نامہ جدید کا سریانی اور لاطینی میں ترجمہ ہو چکا ہوا تھا۔... سریانی ارامی زبان کی ایک بولی ہے۔ ارامی زبان حضرت عیسیٰ کی مقامی زبان بھی تھی اور میسوپوٹیمیا اور شام کی بھی۔ یہ بات معروف ہے کہ ۱۵۰ اور ۱۷۵ء کے درمیان وادئ فرات میں واقع عدیسہ شہر میں ایک کتاب مروج تھی، جو ڈایاٹسرون (Diatessaron) کے نام سے مشہور تھی۔... یہ ایک صاحب علم شخص طاشیئن نے لکھی تھی، جو وادئ فرات کا باشندہ تھا جہاں وہ قریباً ۱۱۰ء میں پیدا ہوا تھا۔... اس کی یہ کتاب غالباً روم میں لکھی گئی تھی اور پھر اسے شام میں لے جایا گیا۔ وہاں اس کا سریانی میں ترجمہ کیا گیا۔ مشہور یہ ہے کہ یہی ترجمہ وہ بڑی صورت تھی جس میں چوتھی صدی تک انجیل کی کہانی ملک شام میں رائج تھی۔''

بروس ایم میٹزجر نے سریانی تراجم پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

''Scholars have distinguished five different Syriac versions of all or part of the NT. They are the Old Syriac, The Peshitta (or common version), the Philoxenian, the Harclean, and the Palestinian Syriac version.

(a) The Old Syriac version of the four Gospels is preserved today in two manuscripts, both of which have large gaps. ...

(b) The Peshitta version, or Syriac Vulagate, of the NT was prepared toward the end of the fourth century, probably in order to supplant the divergent, competing Old Syriac translations. ... More than 350 manuscripts of the Peshitta NT are known today, several of which date from the fifth and sixth centuries. ...

(c) The Philoxenian and/or Harclean version(s). ...

(d) The Palestinian Syriac version. The translation into Christian Palestinian Syriac (i.e. Aramaic) is known chiefly from a lectionary of the Gospels, preserved in three manuscripts dating from the eleventh and twelfth centuries.'' (Bruce M. Metzger, The Text of the New Testament, Oxford at the Clarendon Press, 1964, pp. 68-71)

''علمانے پورے یا جزوی عہد نامۂ جدید کے پانچ مختلف سریانی تراجم کو ممتاز قرار دیا ہے۔ وہ ہیں قدیم سریانی، پشیتا یا عوامی ترجمہ، فلوکسینین، ہرقلین اور فلسطینی سریانی ترجمہ۔

ا۔ چار انجیلوں کا قدیم سریانی ترجمہ آج دو مسودات کی شکل میں محفوظ ہے، جن دونوں میں بڑے بڑے خلا موجود

www.javedahmadghamidi.com

ہیں۔

ب۔عہد نامۂ جدید کا پشیتا ترجمہ یا سریانی زبان کا ولگیٹ۔یہ چوتھی صدی کے اختتام کے قریب تیار ہوا تھا۔اس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ یہ اختلافات اور تضادات سے معمور سریانی تراجم کی جگہ لے سکے۔...آج پشیتا کے عہد نامۂ جدید کے ۳۵۰ سے زائد مسودات معلوم ہیں، جن میں سے اکثر کی تاریخ پانچویں اور چھٹی صدیوں کی ہے۔

ج۔ فلوکسینین اور/ یا ہرقلین ترجمے۔...

د۔اناجیل کا فلسطین والا سریانی ترجمہ مسیحی فلسطینی سریانی (یعنی آرامی) زبان میں بڑی حد تک انجیلوں کے دعا و عبادت کے اسباق کے ان مجموعوں کے ذریعے سے معلوم ہوا، جو ان تین مسودات کی صورت میں محفوظ ہیں جن کا تعلق گیارھویں اور بارھویں صدیوں سے ہے۔''

دی جرنی فرام ٹیکسٹس ٹو ٹرانسلیشنز کا مصنف پال ڈی ویگنر لکھتا ہے:

"... Jesus probably spoke in Aramaic whereas the Evangelists recorded his sayings in Greek." (Paul D. Wegner, The Journey from Texts to Translations, Grand Papids, Michigan, Baker Books, 1999, p.61)

''...حضرت عیسیٰ غالباً آرامی زبان میں کلام فرماتے تھے، جب کہ انجیل نگاروں نے ان کے ارشادات یونانی زبان میں ریکارڈ کیے۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

"... Christianity spread very early into Syria, and from there the Syriac church took the Gospel as far as China. ... Syriac, generally the name given to Christian Aramaic, is written in distinctive variation of the Aramaic alphabet.

Tatian Diatessaron

Tatian came from Mesopotamia to Rome in about 150; he was converted to Christianity and taught by Justin Martyr. ... His major work was the earliest known harmony of the four Gospels, called the Diatessaron, written in Syriac. The word diatessaron literally means "through four". That is to say, the work weaves all four Gospel into one continuous narrative. ... It is unknown whether the work was originally written in Greek (the name diatessaron is Greek) or Syriac, but it gained popularity due in large part to Ephraem, a Syrian church father from Edessa (306-373), who wrote a commentary on it. Later the Diatessaron

was translated into Persian, Arabic, Latin, Old Dutch, Medieval German, Old Italian, and Middle English.

Syriac Peshitta

For centuries several Syriac translations, as they circulated throughout this Area, competed for superiority. Most were in Old Syriac, but around the fifth century the Syriac Peshitta emerged, perhaps prepared by Rabbula, who was bishop of Edessa from 411 to 435. By about 400 Theodore of Mopsuestia, an early church father, wrote concering the Syriac Peshitta: "it has been translated into the tongue of the Syrians by someone or other, for it has not been learned up to the present day who this was." In the fifth century the Syriac church split into two groups the Nestorians (East Syriac) and the Jacobites (West Syriac) resulting in two proper recensions [revised editions, compilations] of the Syriac Peshitta.” (Paul D. Wegner, The Journey from Texts to Translations, op.cit., pp.242-43)

”مسیحیت بہت جلد ملک شام میں پھیل گئی اور وہاں سے سریانی کلیسیا انجیل کو چین جیسے دور دراز علاقے میں لے گیا۔... سریانی، جو نام بالعموم مسیحیوں کی ارامی زبان کو دیا جاتا تھا، ارامی زبان کے حروف تہجی سے مختلف اور امتیازی انداز میں لکھی جاتی ہے [سریانی رسم الخط عربی زبان کے رسم الخط سے کافی ملتا جلتا ہے۔ علما کا غالب خیال یہ ہے کہ عربی رسم الخط کی تشکیل پر سریانی رسم الخط کا کافی اثر ہے]

طاشیئن کا ڈایاٹسران

طاشیئن قریباً ۱۵۰ء میں میسوپٹیمیا (عراق) سے روم میں پہنچا۔ اسے شہید جسٹن نے مسیحی بنایا تھا اور اسی نے اسے مسیحیت کی تعلیم دی تھی۔... سب سے پہلے اس نے ”چاروں انجیلوں کی یکسانیت اور ہم آہنگی“ نامی کتاب لکھی تھی جو اس کی سب سے پہلی اور بڑی اہم کتاب ہے اور جو ڈایاٹسران کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سریانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ لفظ ڈایاٹسران کے لغوی معنی ہیں ’چار کے اندر سے‘۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ اس کتاب میں چاروں کی چاروں انجیلیں ایک مسلسل حکایت کے طور پر بن دی گئی ہیں۔... اس بات کا علم نہیں کہ کیا یہ کتاب ابتداءً یونانی زبان میں لکھی گئی تھی (ڈایاٹسران یونانی زبان ہی کا لفظ ہے)، یا سریانی میں۔ لیکن اس نے بڑی حد تک عدیسہ سے تعلق رکھنے والے سریانی کلیسیا کے ایک بزرگ افرائیم (۳۰۶۔۳۷۳)، کی وجہ سے قبولیت عامہ حاصل کی جس نے اس

کی ایک تفسیر لکھی تھی۔ بعد میں ڈایاٹسران کا فارسی، عربی، لاطینی، قدیم ڈچ زبان، درمیانے دور کی جرمن زبان، قدیم اطالوی اور درمیانے دور کی انگریزی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔

سریانی پشیتا

''اس پورے خطے میں جو متعدد سریانی تراجم زیر گردش تھے، وہ صدیوں تک برتری کے حصول کے لیے برسر پیکار رہے۔ ان میں سے زیادہ تر سریانی زبان میں تھے۔ لیکن پانچویں صدی کے قریب سریانی زبان کی پشیتا بائبل کو فروغ حاصل ہوا، جو شاید ربولا نے تیار کی تھی۔ ربولا ۴۱۱ء سے ۴۳۵ء تک عدیسہ کا بشپ رہا تھا۔ ۴۰۰ء کے قریب ایک ابتدائی کلیسیائی فادر، تھیوڈور آف موپسواستیا(Theodore of Mopsuestia) نے سریانی زبان کی پشیتا بائبل کے متعلق لکھا: 'کسی نہ کسی شخص نے اس کا شامی لوگوں کی زبانوں میں ترجمہ کر دیا، لیکن اس بات کا پتا نہیں چل سکا کہ یہ (مترجم) کون تھا۔' پانچویں صدی میں سریانی کلیسیا دو گروہوں میں بٹ گیا: (۱) نسطوری (مشرقی سریانی) اور (۲) یعقوبی (مغربی سریانی)۔ جس کے نتیجے میں سریانی پشیتا کے دو موزوں نظر ثانی شدہ ایڈیشن معرض وجود میں آ گئے۔''

یہی مصنف عربی تراجم کے سلسلے میں لکھتا ہے:

''In antiquity Arabia covered the area west of Mesopotamia, south of Syria, and east of Palestine; ... Very little is known about early Christian contacts with this era, ... Little is known about the first translation of the Bible into Arabic, ... The spread of Islam in the seventh century forced Jews and Christians who remained in the conquered lands to adopt Arabic. ... The Scriptures do not seem to have been extant in an Arabic version before the time of Muhammad (570-632), who knew the gospel story only in oral form, and mainly from Syriac sources. ... Evidence suggests that translations into Arabic were made from Greek, Old Syriac, the Syriac Peshitta, Coptic, and Latin versions.'' (Paul D. Wegner, The Journey from Texts to Translations, op. cit., p.249-50)

''قدیم ملک عرب میسوپٹیمیا (عراق) کے مغرب، شام کے جنوب اور فلسطین کے مشرق کے علاقوں پر محیط تھا۔ ... اس علاقے کے ساتھ ابتدائی مسیحیوں کے روابط کے متعلق بہت کم باتیں معلوم ہیں۔ ... بائبل کے عربی زبان میں اولین ترجمے کے بارے میں زیادہ معلومات دستیاب نہیں۔ ... ساتویں صدی میں اسلام کی اشاعت نے ان

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

یہود ونصاریٰ کو، جو مسلمانوں کے مفتوحہ علاقوں ہی میں رہایش پذیر ہو گئے، اس بات پر مجبور کیا کہ وہ عربی زبان اختیار کریں۔... معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم (۵۷۰ء تا ۶۳۲ء) سے پہلے کے دور میں صحف بائبل کسی عربی ترجمے کی صورت میں موجود نہ تھے۔ رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم انجیلوں کی کہانی صرف زبانی صورت میں جانتے تھے اور وہ بھی زیادہ تر سریانی ماخذ سے۔... شہادت اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ انجیل کے عربی زبان میں تراجم یونانی، قدیم سریانی، سریانی پشیتا، قبطی اور لاطینی تراجم سے کیے گئے تھے۔''

جان ایل میکنزی اپنی لغت بائبل میں سریانی تراجم کے ذیل میں لکھتا ہے:

''Syriac designates several dialects of Aramaic which arose in the early centuries of the Christian era in Old Aramaic speaking regions, which roughly include the modern Israel and Jordan, Syria, Lebanon, the portion of Turkey adjacent to Syria, and Iraq. The dialects of Syriac fall into two principal groups, eastern and western. As a living language Syriac fell into disuse with the Mohammedan conquests and yielded to Arabic; it now survives as a liturgical language in some dissident eastern churches and in a few isolated pockets. ... The Old Syriac versions are the versions older than the Peshitto NT. These were replaced in common use by the Peshitto and have survived only in fragments.'' (John L. McKenzie, S.J., Dictonary of The Bible, London, Geoffrey Chapman, 1984, p.860)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''سریانی حقیقت میں آرامی زبان کی متعدد بولیوں کو ظاہر کرتی ہے، جس نے قدیم ارامی بولنے والے علاقوں میں سن عیسوی کی ابتدائی صدیوں میں فروغ پایا۔ یہ علاقے جدید اسرائیل اور اردن، شام، لبنان، ترکی کے شام سے ملحقہ حصے اور عراق پر مشتمل ہیں۔ سریانی زبان کی بولیوں کے دو بڑے گروپ ہیں: مشرقی اور مغربی۔ اسلامی فتوحات کے نتیجے میں سریانی زندہ زبان کی حیثیت سے استعمال میں نہیں رہی اور عربی نے اس کی جگہ لے لی۔ اب یہ الگ تھلگ ٹکڑوں میں اکثریت سے اختلاف رائے رکھنے والے چند ایک کلیسیاؤں میں مذہبی عبادت کی زبان کے طور پر باقی ہے۔... قدیم سریانی تراجم پشیتا سے پہلے کے تراجم ہیں۔ عام استعمال میں پشیتا نے ان کی جگہ لے لی ہے اور اب ان کے کچھ اجزا ہی باقی رہ گئے ہیں۔''

ہارپرز بائبل ڈکشنری میں فلپ ایل شولر نے بھی اس موضوع پر یہی نقطۂ نظر پیش کیا ہے کہ عہد نامۂ جدید کی

کتابیں رائج الوقت عوامی یونانی زبان میں لکھی گئیں:

"The NT books were written in Koine Greek, the language of that day." (Harper's B. D., Gen. Ed. Paul J. Achtemeier, Bangalore, Theological Publications in India, 1994, p. 1042)

''عہد نامۂ جدید کی کتابیں اس دور کی مروجہ زبان یونانی کوائنی میں لکھی گئی تھیں۔''

یہی مصنف مزید لکھتا ہے:

"One of the first efforts to render the Greek Gospel into Syriac was that of Tatian, who produced what has come to be called the Diatessaron. ... He wove the four Gospels together into one continuous account. It came to be known in the East as the "mixed" Gospel. The whole work had some fifty-five chapters, and that suggests that the Diatessaron was designed to be read in the churches. The Diatessaron became very popular and was translated into a number of other languages (Persian, Arabic, ... In 1933, a fragment of the Diatessaron in Greek was discovered and so there has been some debate on whether the "harmony" was made first in Greek and then translated into Syriac or whether it was made in Syriac to begin with.

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

For some time, the Diatessaron circulated side by side with other Syriac translations of the Gospels, known as the Old Syriac vss. ... As time went on, the Old Syriac vs was superseded by the Peshitta.

The Peshitta (Syriac, "simple") was prepared in the early part of the fifth century and became the standard version of the Syriac church. ...

In A.D. 509, Philoxenus, bishop in eastern Syria, asked a certain Polycarp to revise the Peshitta. His effort was in turn revised again in 616 by Thomas Harkel. ... There is also the Palestinian Syriac vs in the Aramaic dialect of Christians in Palestine." (Harper's B. D., Gen. Ed. Paul J. Achtemeier, op.cit., pp. 1047, 48)

''یونانی انجیلوں کا سریانی میں ترجمہ کرنے کی اولین کوششوں میں سے ایک کوشش طاشیئن کی تھی، جس نے

ڈایاٹسران نامی کتاب تخلیق کی۔...اس نے چار انجیلوں کو یکجا مربوط کر کے ایک مسلسل بیان کی شکل دے دی۔ مشرق میں اسے 'مخلوط' انجیل کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ساری کتاب کے کوئی پچپن ابواب تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈایاٹسران کلیسیاؤں میں تلاوت کے لیے مرتب کی گئی تھی۔ ڈایاٹسران نے بہت قبولیت عامہ حاصل کی اور اس کا متعدد دوسری زبانوں میں ترجمہ کیا گیا (فارسی، عربی، لاطینی، ولندیزی، عہد وسطیٰ کی جرمن، قدیم اطالوی، اور درمیانے دور کی انگریزی)۔ ۱۹۳۳ء میں ڈایاٹسران کا یونانی زبان میں ایک ٹکڑا دریافت ہوا جس کے نتیجے میں یہ بحث چل نکلی کہ کیا یہ 'انجیلوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے والی کتاب' کا پہلے یونانی میں لکھ کر پھر سریانی میں ترجمہ کیا گیا تھا یا یہ شروع ہی سے سریانی میں لکھی گئی تھی [واضح رہے کہ ڈایاٹسٹران بذات خود کوئی ایسی انجیل نہیں جو مسیحیوں کی مسلمہ بائبل (عہد نامۂ جدید) میں باقاعدہ شامل ہو۔ یہ تو چاروں انجیلوں کے بعض اجزا کا ایک تقابلی مطالعہ ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ یہ شروع میں یونانی میں لکھا گیا اور بعد میں اس کا سریانی میں ترجمہ کیا گیا، یا یہ شروع ہی سے سریانی میں لکھا گیا۔ اتنی بات صاف واضح ہے کہ اصلاً یہ یونانی زبان میں لکھی گئی اناجیل سے مرتب کیا گیا ہے بہرحال یہ یونانی سے ترجمہ ہے اس کی اصل سریانی ہرگز نہیں]۔

کچھ وقت تک تو ڈایاٹسران انجیلوں کے ان دوسرے سریانی تراجم کے پہلو بہ پہلو زیر استعمال رہی جنھیں قدیم سریانی تراجم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔...جوں جوں وقت گزرتا گیا، پشیتا قدیم سریانی تراجم کو ختم کر کے ان کی جگہ لیتی رہی۔

پشیتا پانچویں صدی عیسوی کے ابتدائی حصے میں تیار کی گئی تھی اور یہ سریانی کلیسیا کا اسٹینڈرڈ ورژن (معیاری و مستند ترجمہ) بن گئی۔...

۵۰۹ عیسوی میں مشرقی شام کے بشپ فلوکسینس نے پولی کارپ نامی ایک شخص کو پشیتا کی نظر ثانی کے لیے کہا۔ آگے چل کر اس کی اس کاوش پر ۶۱۶ء میں تھامس آف ہرقل نے دوبارہ نظر ثانی کی۔...فلسطینی مسیحیوں کی آرامی بولی میں بھی فلسطینی سریانی کا ایک ترجمہ موجود ہے۔''

سر فریڈرک کینین اپنی کتاب 'ہماری بائبل اور قدیم مسودات' میں لکھتے ہیں:

''Several Arabic versions are known to exist, some being translations from the Greek, some from Syriac, and some from Coptic, while others are revisions based upon some or all of these. None is earlier than the seventh century, perhaps none so early; and for crirtical purposes none is of any value.'' (Sir Frederic Kenyon, Our Bible and the Ancient Manuscripts, NY, Harper and Brothers: Publishers, 1951, p.170)

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

''یہ بات معروف ہے کہ متعدد عربی تراجم بھی موجود تھے۔ ان میں سے بعض کا یونانی زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا، بعض کا سریانی سے اور بعض کا قبطی سے، جبکہ دوسرے تراجم ان میں سے بعض یا تمام کی نظر ثانی پر مبنی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ساتویں صدی سے پہلے کا نہیں، بلکہ شاید کوئی بھی زیادہ قدیم نہیں اور ان میں سے کسی کی بھی تنقیدی مقاصد کے سلسلے میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔''

ایف ایف بروس اپنی کتاب 'دی بکس اینڈ دی پارچمنٹس' میں رقم طراز ہیں:

''Aramaic remained the vernacular tongue of Palestine, as well as Syria and other adjoining territories, until the Arab conquest of these lands in the seventh century A.D. It was thus the language commonly spoken in Palestine in NT times, the customary language of our Lord and His apostles and the early Palestine church.'' (F. F. Bruce, The Books and the Parchment, London, Pickering & Inglis Ltd., 1963, p. 56)

''آرامی زبان فلسطین، شام اور اس سے ملحق دوسرے علاقوں کی ساتویں صدی عیسوی میں عربوں کے ہاتھوں فتوحات تک ان علاقوں کی روزمرہ کی مقامی زبان کی حیثیت سے موجود رہی۔ اس طرح یہ ایک ایسی زبان تھی جو عہد نامۂ جدید کے دور میں فلسطین میں عام طور پر بولی جاتی تھی اور ہمارے خداوند (حضرت عیسیٰ)، ان کے حواریوں اور ابتدائی فلسطینی کلیسیا کی روزمرہ کی زبان تھی۔''

www.javedahmadghamidi.com
www.ghamidi.net

اوپر جو کچھ پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ابتداءً کوئی بھی انجیل سریانی زبان میں نہیں لکھی گئی تھی، بلکہ ضرورت کے تحت اولاً دوسری صدی عیسوی میں اس کا سریانی میں ترجمہ کیا گیا تھا۔ بعد میں پانچویں، چھٹی، ساتویں صدی عیسوی میں بھی انجیل/ عہد نامۂ جدید کے سریانی زبان میں مختلف تراجم وجود میں آئے۔ ظاہر ہے کہ اگر بائبل کا عہد نامۂ جدید (انجیل وغیرہ) سریانی زبان میں لکھا گیا تھا تو پھر اس کا سریانی میں 'ترجمہ' کرنے کی کیا ضرورت تھی۔

جناب محمد اسلم صدیق صاحب نے یہ جو لکھا ہے: 'حقیقت یہ ہے کہ اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ یا ان کے حواری اور ابتدائی متبعین یونانی زبان جانتے تھے۔' تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ اوپر کوئی تیس چالیس حوالوں سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ 'حضرت عیسیٰ، ان کے حواری اور ابتدائی متبعین یونانی زبان جانتے تھے۔' اب بھی کوئی شخص یہ کہتا رہے کہ ''اس بات کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ یا ان کے حواری اور ابتدائی متبعین یونانی زبان جانتے تھے'' تو:

اور یہ جو فرمایا گیا ہے:

''اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار نے Jewish Ency ۲۴۷/۹ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ Papias جو دوسری صدی میلادی کے اوائل کا ماخذ ہے، بتاتا ہے کہ متی نے مسیح کے ملفوظات کا مجموعہ کسی تاریخی ترتیب کے بغیر عبرانی (یا آرامی) زبان میں تیار کیا تھا اور مرقس نے متفرق طور پر پطرس حواری سے جو کچھ سنا تھا، اسے مرتب کیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ پطرس کی زبان بھی یونانی نہیں تھی، بلکہ عبرانی اور آرامی آمیز سریانی ہی تھی تو واضح ہوا کہ متی اور مرقس کے صحیفے یونانی زبان میں نہیں لکھے گئے تھے۔''

تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ یہ شوشہ صرف پاپیاس نے چھوڑا تھا کہ متی نے اپنی انجیل آرامی زبان میں لکھی تھی۔ آگے چل کر جس نے بھی یہ بات کہی ہے، اس نے یا تو پاپیاس کے حوالے سے کہی ہے یا اس کا ماخذ پاپیاس ہے۔ لیکن کسی بھی صاحب تحقیق عالم نے پاپیاس کی یہ بات قبول نہیں کی۔ اگر کسی نے پاپیاس کے ساتھ رعایت کا سلوک کیا ہے، تو اس نے بھی بس یہی بات کہی ہے کہ غالباً پاپیاس کی مراد یہ تھی کہ ابتدا میں متی نے حضرت عیسیٰ کے حوالے سے کچھ یادداشتیں مختصر طور پر آرامی زبان میں لکھ لی تھیں، لیکن بعد میں جب اس نے موجودہ انجیل لکھی، تو وہ یونانی ہی میں تھی۔ ہم اس کی وضاحت اوپر تفصیل سے بیان کر چکے ہیں، اس لیے یہاں اس کے متعلق مزید کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ باقی رہا معاملہ انجیل مرقس کا تو جو کچھ اس سلسلے میں لکھا گیا ہے، وہ محض مغالطہ آرائی ہے۔ یہ بات تو کسی حد تک درست ہے کہ انجیل مرقس کا ماخذ پطرس حواری ہے اور یہ بھی درست ہے کہ پطرس آرامی زبان جانتا تھا، لیکن یہ بات درست نہیں کہ مرقس نے اپنی انجیل یونانی میں نہیں، بلکہ آرامی میں لکھی تھی۔ اس سلسلے میں بھی اوپر حوالہ گزر چکا ہے۔

باقی رہا جناب مضمون نگار کا یہ ارشاد: 'نیز اردو دائرۂ معارف اسلامی کے مقالہ نگار نے The Birth of Christ, Alfred Loisey Religion صفحہ ۳۶۶ تعلیقہ ۶۰ کے حوالے سے لکھا ہے کہ یوحنا کی انجیل آرامی میں تحریر تھی۔' تو اس سلسلے میں گزارش ہے کہ یہ صرف چند لوگوں کی بے بنیاد اور بے دلیل رائے ہے۔ اس انجیل کی اندرونی اور لسانی شہادت اور معتبر صاحب تحقیق نقادان فن کی دوٹوک رائے سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ یونانی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اس سلسلے میں صرف ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے (اگرچہ اوپر سارے عہد نامۂ جدید کے یونانی میں لکھے جانے کے سلسلے میں متعدد اقتباس دیے جا چکے ہیں اور انجیل یوحنا عہد نامۂ جدید کا ایک حصہ ہے، لہٰذا ظاہر ہے کہ وہ بھی یونانی ہی میں لکھی گئی تھی):

"Some (Wellhausen, Burney, Torrey) have suggested that John is a

translation of an Aramaic original; the majority of scholars have not accepted this proposal, since the Greek is not evidently a translation. There are some Hebrew and Aramaic words which are interpreted (1:38, 41f; 4:25; 5:2; 9:7; 19:17; 20:16, 24). Boismard cautiously concludes that while it is too much to say that the entire Gospel had an Aramaic orignal, it is possible that parts of it may have been composed in Aramaic.'' (John L. McKenzie, D.B. op. cit., p. 447).

''بعض (ویلہاسن، برنی،ٹوری) نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ انجیل یوحنا کسی آرامی الاصل کتاب کا ترجمہ ہے۔علما کی اکثریت نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا، کیونکہ یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ اس انجیل کی یونانی زبان کسی طرح بھی ترجمہ نظر نہیں آتی۔البتہ اس میں کچھ عبرانی اور آرامی الفاظ ضرور موجود ہیں جن کا ترجمہ کر دیا گیا ہے (1:38, 41f; 4:25; 5:2; 9:7; 19:17; 20:16, 24). [اور یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔علمی دنیا میں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ ایک زبان کی کتاب میں کسی دوسری زبان کے الفاظ نقل کر دیے جاتے ہیں]۔بوائسمرڈ نے بڑے احتیاط سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگرچہ یہ کہنا بہت زیادہ [مشکل] ہے کہ پوری انجیل یوحنا اصلاً آرامی زبان میں لکھی گئی تھی، تاہم اس بات کا امکان ہے کہ اس کے کچھ اجزا آرامی زبان میں ترتیب پائے ہوں۔''

جہاں تک Q کا تعلق ہے اس سلسلے میں بھی اوپر وضاحت موجود ہے، تاہم اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ Q کا واقعی کوئی وجود تھا اور کسی صاحب 'نے بڑی دانش مندی سے اس امکان کا اظہار کیا ہے کہ Q کا اصل نسخہ آرامی زبان میں تھا' (محدث صفحہ ۱۲۹ سطر ۶۔۷)، تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ اصل انجیلیں بھی آرامی زبان میں لکھی گئی تھیں، جبکہ اوپر بیسیوں حوالوں سے یہ ثابت کر دیا گیا ہے کہ انجیلیں ابتداءً یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔

جناب محمد اسلم صدیق صاحب نے ایک غیر متعلق اور عجیب سا اعتراض بھی کیا ہے۔اگرچہ اس کا جواب دینے کی ضرورت تو نہیں، تاہم اسے درج کر کے اس پر مختصر تبصرہ بھی کیا جا رہا ہے:

''نیز اس نے لکھا ہے کہ 'محرف مسیحی ادب' میں ایک انجیل یہودیہ ہے، یہ مغربی آرامی زبان میں تھی اور یہ انجیل مسیحیوں کے ابتدائی فرقوں میں سے ناصریوں اور ابیاتیوں میں دوسری صدی کے نصف ۱۵۰ء تک رائج رہی، بعد میں ان فرقوں کی تباہی کے ساتھ یہ انجیل بھی گم ہو گئی۔اور یونانی تراجم کی ابتدا یقیناً اس کے بعد ہوئی۔''

بات یہاں کسی خارج از عہد نامۂ جدید 'محرف مسیحی ادب' کی نہیں ہو رہی، بلکہ یہاں تو زیر بحث صرف وہ انجیلیں ہیں جو عہد نامۂ جدید میں موجود ہیں اور جنھیں مسیحی حضرات قانونی اور مستند کتابیں مانتے ہیں۔محترم مضمون نگار نے

بات کو پھیلا کر اس سے جو یقینی نتیجہ نکالا ہے اس کے متعلق بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ 'ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ'! آخری دو پیروں میں محترم مضمون نگار نے انجیل برناباس کے حوالے سے بات کی ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ ہمارے یہاں سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامے رینی ساں (Reanaissance) میں اس موضوع پر میرے ایک مضمون کی تین اقساط شائع ہو چکی ہیں۔ اگر محترم مضمون نگار ان پر نظر ڈال کر کچھ فرمانا چاہیں تو بات زیادہ مناسب ہوگی۔

جہاں تک امام قسطلانی اور علامہ عینی کی تشریحات کا تعلق ہے تو اس پر ایک مستقل مضمون میں گفتگو کی جا سکتی ہے، جس کی فی الحال ضرورت محسوس نہیں ہوتی، تاہم چند جملوں میں بات سمیٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کے زمانے میں فلسطین میں آرامی زبان بھی بولی جاتی تھی اور یونانی بھی۔ یونانی زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی، اس لیے دفاتر، چھاؤنیوں، تجارتی مراکز اور عدالتوں میں اس کا چلن زیادہ تھا۔ حضرت عیسیٰ کی اپنی زبان آرامی تھی اور سریانی بھی اسی کی ایک ذیلی بولی تھی۔ اس دور میں سریانی آہستہ آہستہ آرامی زبان کی جگہ لینے لگی تھی۔ لیکن چونکہ سریانی اور آرامی میں کوئی جوہری فرق نہ تھا، اس لیے آرامی اور سریانی کے الفاظ ایک دوسرے کے متبادل کے طور پر بھی استعمال ہوتے تھے۔ انجیل ابتداءً تو یونانی زبان ہی میں لکھی گئی تھی، لیکن ضرورت کے تحت بعد میں اس کا سریانی زبان میں بھی ترجمہ کر دیا گیا تھا۔ سریانی ترجمہ انجیل کے بالکل ابتدائی تراجم میں شامل ہے۔ سریانی زبان عربی زبان سے بہت قریب ہے اور عربوں کے لیے اسے سمجھنا کوئی بہت زیادہ مشکل کام نہ تھا۔ تھوڑی سی محنت کے ذریعے سے اس کی واقفیت حاصل کر لینا ممکن تھا۔ اس لیے سرزمین عرب کے اہل علم کی رسائی سریانی انجیل تک زیادہ مشکل نہ تھی۔ اوپر یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ ابتداءً انجیل کا عربی ترجمہ سریانی ہی سے کیا گیا تھا، اگرچہ بعد میں بعض دوسری زبانوں سے بھی انجیل کا عربی میں ترجمہ کیا گیا۔ اس طرح یہ کوئی انہونی بات نہیں کہ ان بزرگوں نے سریانی ہی کو انجیل کی اصل زبان سمجھ لیا ہو۔ یہ اس لیے بھی ممکن ہے کہ ان بزرگوں کا مرکز تحقیق یہ علوم نہ تھے۔ کبھی ضرورت محسوس ہوئی تو اس موضوع پر بھی تفصیل سے لکھ دیا جائے گا۔ 'ان شاء اللّٰہ و بتوفیقہٖ ذالك ما عندی و العلم عنداللّٰہ اللھم ارنا حقائق الاشیاء کما ھی'۔